نشانِ راہ

حسن ظفر نقوی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نشانِ راہ

جن مذہب و ملت کے دشمن طبقوں کی میں نے نقاب کشائی کی ہے ان میں وہ استثنائی افراد شامل نہیں ہیں جو ہر فرعون کے دربار میں مومنِ آلِ فرعون بن کر زندگی گزارتے ہیں۔ اور جب حق کی نصرت کا وقت آتا ہے تو حق کی خاطر آگ میں جل جانا گوارا کرتے ہیں۔ مگر فرعون کی ہم نوائی نہیں کرتے۔

حسن ظفر نقوی

❀ ❀ ❀

انتساب

جناب ابوذر غفاریؓ کے نام

کہ جن کا نام آج بھی جھوٹ کے منہ پر ایک

بھرپور تازیانہ ہے اور قیامت تک رہے گا۔

جملہ حقوق بحقِ مصنف محفوظ ہیں۔

کتاب کا نام۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ نشانِ راہ۔

مصنف۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ حسن ظفر نقوی

سرورق۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ امتیاز

ترتیب و تزئین۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ نعمان

سالِ اشاعت۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ستمبر / 2000

تعداد۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔1000

قیمت۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ 50/- روپے

پبلشر۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اے۔ بی۔ پرنٹرز، کراچی۔

فہرست

-1	اظہارِ رائے ---------- حضرت مولانا ابنِ حسن کربلائی	صفحہ 7
-2	منزل کی جانب ایک قدم ----- آلِ محمد رزمی	صفحہ 11
-3	نشانِ راہ کی جانب -------- پروفیسر محسن نقوی	صفحہ 25
-4	اظہارِ تشکر -------- حسن ظفر نقوی	صفحہ 29
-5	کیا کیا جائے؟ ----------------------------	صفحہ 33
-6	آغازِ کار ----------------------------	صفحہ 49
-7	ذمہ داریاں ----------------------------	صفحہ 57
-8	دینی مدارس کی اصلاح ----------------------------	صفحہ 63
-9	کالجز کے طلباء کی ذمہ داریاں ----------------------------	صفحہ 69
-10	عزادارنِ حسینؑ ----------------------------	صفحہ 77
-11	خطباء، ذاکرین وغیرہ ----------------------------	صفحہ 87
-12	کنیزانِ سیدہ وزینب سلام اللہ علیھما ----------------------------	صفحہ 93
-13	تنظیمی کارکنوں سے ----------------------------	صفحہ 99
-14	نشانِ راہ ----------------------------	صفحہ 103

❀ ❀ ❀

حجۃ الاسلام والمسلمین حضرت آقائے

ابنِ حسن الرضوی کربلائی (آلِ باقر العلومؒ)

اظہارِ رائے

الحمدللّٰہِ ربّ العالمین والصّلوٰۃ والسلام علیٰ

اشرف خلقہِ محمدٍ و آلہِ الطّیّبین الطّاھرین

و لعنۃ اللّٰہِ علیٰ اعدائھم اجمعینْ اما بعد

حجۃ الاسلام والمسلمین مولانا سید حسن ظفر نقوی دامَ تائیدہ کی شخصیت مُحتاجِ تعارف نہیں، اصلاحِ معاشرہ کے موضوع پر آپ کا معرکۃ الارآء مضمون نظرِ قاصر سے گزرا۔

حقیقتِ امر یہ ہے کہ ہمارے تنزّل اور انحطاط کا سبب ایمان کی کمزوری اور دینِ اسلام سے دوری ہے۔ مولائے کائنات حضرت امیر المومنین علیہِ الصلوٰۃ والسلام کا ارشادِ گرامی ہے۔

" مفارقة الدينِ مفارقة الامن فلا يتهنّابحياةٍ مع مخافةٍ "

دین سے دوری امن سے دوری ہے، خوف کی حالت میں انسان کی زندگی کبھی خوشگوار نہیں ہو سکتی۔

ہماری زبان پر تو اسلام کا نام ہوتا ہے لیکن ہم اپنے عمل سے خود اسلام کے قوانین کی مخالفت کرتے ہیں۔

اسلامی معاشرے میں ہر طرف ریاکاری، ظاہرداری ،خودنمائی ، ناانصافی، مکروفریب، بغض و حسد اور غدر وخیانت کا بازار گرم ہے ساری برائیاں سمٹ کر ہمارے معاشرے میں آگئی ہیں۔

یہ عجیب وغریب بات ہے کہ جب دوسری قومیں اپنے دین سے دوری اختیار کرتی ہیں تو وہ ترقی کرتی ہیں۔ لیکن مسلمان جب اپنے دین سے دوری اختیار کرتا ہے تو وہ تنزّل و انحطاط کا شکار ہو جاتا ہے۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ دیگر مذاہب وادیان مانعِ ترقی ہیں اور دینِ اسلام ضامنِ ترقی ہے۔

دانشمندی کا تقاضہ یہی ہے کہ ہم خود اپنی اصلاح کرلیں قبل اس کے کہ اسلام دشمن طاقتیں ہماری اصلاح کریں۔

ملّتِ شیعہ اگرچہ ملّتِ واحدہ ہے لیکن جغرافیائی اعتبار سے اس کے مورچے الگ

الگ ہیں۔

اگر ایران اور عراق میں جیدّ علماء ، مجتہدین و مراجع عظام پیدا ہو سکتے ہیں تو کیا ہمارے ملک میں ایسا نہیں ہو سکتا ؟ کیا ہمارے ملک میں عقل و شعور کی کمی ہے ؟۔

اگر ہمارے ہاں عقل و دانش کی کمی ہوتی تو پاکستان میں بڑے بڑے ماہر ڈاکٹر، انجینئیر اور سائنسدان پیدا نہ ہوتے۔

ہمارے ملک میں عقل کی کمی نہیں ہے ،بلکہ نظام کا فقدان ہے۔ حوزۂ علمیہ نجف اشرف کے بعد لکھنؤ مرکزِ علم و اجتہاد سمجھا جاتا تھا۔ لیکن آج وہاں کے شریعت کدے ویران پڑے ہیں۔

تقریباً بیس برس قبل جب میں لکھنؤ گیا تو میں نے وہاں ایک عجیب و غریب منظر دیکھا۔ ایک شریعت کدہ جہاں مسندِ اجتہاد بچھی رہتی تھی، فتاویٰ جاری کئے جاتے تھے ،وہاں کام دانی اور زرچوبی کا کام ہو رہا تھا۔

اک ہم ہیں کہ لیا اپنی ہی صورت کو بگاڑ
اک وہ ہیں جنھیں تصویر بنانا آتی ہے

آخر میں ، میں یہی کہوں گا کہ ہمارے ملک میں ایسے حساس و فعّال ادارے کی ضرورت ہے جس سے وابستہ افراد دینی و دنیاوی علوم سے آراستہ ہوں ،اور اپنے ملک ،اپنی قوم

اور اپنے دین کی بہتر سے بہتر طریقے سے خدمت کر سکیں۔ خدا مولانا حسن ظفر نقوی کی اس سعیِ جمیلہ کو قبول فرمائے، جو انہوں نے انتہائی خلوص کے ساتھ اصلاحِ ملت کے سلسلے میں فرمائی ہے۔

والسلام

سید ابن حسن الرضوی

(آلِ باقر العلومؒ)

آلِ محمد رزمی

ایڈیٹر ماہنامہ اصلاح، کراچی۔

نشانِ راہ۔۔۔۔۔ منزل کی جانب ایک قدم

تاریخ درسگاہ حکمت اسی لیئے ہے کہ وہ آئینہ دار عبرت ہے!

پوری کائنات خدا کی سلطنت ہے اور جسطرح اس کے سنن ونوامیس اس سلطنت کے جمادی، نباتی، حیوانی موجودات پر حاوی ہیں اسی طرح انسانی زندگی بھی خواہ وہ فرد کی ہو یا معاشرے کی، اسی کی تقدیرات اور اسی کے ضوابط میں جکڑی ہوئی ہے۔ ان بے لاگ قوانین کے تحت کوئی جامہ اور کمزور قوم یکایک سر اُبھارتی ہے اور دوسری طرف کسی طنطنہ دار قوم کا حال ویسا ہو جاتا ہے، جیسے قصر رفیع الشان کھنڈروں میں بدل جائے کوئی تہذیب عروج پر آتی ہے اور کوئی پہلے سے تسلط یافتہ تہذیب جڑبنیاد سے اُکھڑ جاتی ہے، کوئی شخص بوریا سے اُٹھتا ہے اور عالم اسلام کے دل کی دھڑکن بن جاتا ہے اور کسی دوسرے کے سر سے قدرت تاج نوچتی ہے تو سر بھی اسکے ساتھ زمین پر آگرتا ہے۔

پوری تاریخ عظمتوں اور عبرتوں کا ایک قبرستان ہے یہاں کبھی فرعون بھی تھا

جس نے کہا تھا 'انا ربکم الاعلی' یہاں نمرود بھی گزرا ہے جس نے شان استکبار سے کہا تھا 'انا احیی و اُمیت' یہاں چنگیز و ہلاکو بھی تلواریں لہرا چکے ہیں، جنہوں نے شہروں کو مقتل بنا دیا تھا، خون کے دریا بہائے علم کے چراغ گل کیئے عصمتوں کے گلشن تاراج کیئے۔ یہاں کبھی ہٹلر کا مکہ ہوا میں لہراتا تھا اور مسولینی کی صیادوں جیسی نگاہیں دل سے گزر جایا کرتی تھیں۔

خود ہماری تاریخ اسلام میں یزید، شمر، ابن زیاد، حجاج بن یوسف جیسے ظالم اموی و سفاک عباسی حکمران اور ابن ہیرہ جیسی خونخوار ہستیاں بھی گزری ہیں، پھر قریب کے دور میں مصطفےٰ کمال پاشا، جمال عبد الناصر اور شہنشاہ ایران کا ڈنکا بجتا ہم نے دیکھا مگر جب وہ قدرت کی درانتی کے نیچے آئے اپنے مخالف دین ظالمانہ اعمال کی زد میں آئے تو رنگ کچھ اور ہو گیا سر زمین پاکستان کیسے فراموش کر سکتی ہے، غلام محمد، صدر ایوب اور اس قبیل کے بہت سے حکمرانوں کے ادوار کو جبکہ ان لوگوں کے تخت ہمارے سروں پر بچھے ہوئے تھے لیکن پروردگار عالم نے انہیں اعزاز و کرام کے اسٹیج سے نیچے دھکیل کر پیچھے گرا دیا ان میں کچھ حکمران تقویم پارینہ ہو چکے ہیں، کچھ درس عبرت کے طور پر پس دیوار زنداں ہیں اور کچھ ملک سے فرار ہو گئے ہیں تاریخ کا دھارا کبھی نہیں رکتا۔۔۔۔۔۔

گذشتہ کئی دہائیوں سے شیعہ قوم ردو قدح، پیش و پس، تذبذب اور مایوسی کا شکار ہے، مایوسی کا مرض ایک خطرناک مرض ہے کسی فرد کو لاحق ہو یا کسی قوم کو۔ لیکن مومن کے لئے مایوسی کینسر کا درجہ رکھتی ہے، قرآن کریم میں ارشاد ہوا 'ایمان والے تو وہی ہیں جو اللہ اور اسکے رسول ﷺ پر ایمان لائے، پھر وہ کسی شک اور تذبذب میں نہ پڑے، اور انہوں

نے اللہ کی راہ میں اپنے مال اور اپنی جان سے جہاد کیا۔ یہ لوگ جو ہیں وہی (اپنے ایمان میں) سچّے ہیں (الحجرات ۴۹ : ۱۵)۔ یہی مولانا حسن ظفر نقوی کی تحریر کا بین السطور ہے کہ مایوسی قوموں کے حق میں مضر ثابت ہوتی ہے یہ ٹھیک ہے کہ ہماری قومی حالت بظاہر انتہائی بگڑی ہوئی ہے۔

تاہم تشویش ناک اور مایوس کن حالت میں تغیّر و تبدیلی اور اسکے بظاہر لا ینحل مسائل کا حل بالکل ممکن ہے اسکی کنجی موجود ہے اللہ پر توکل، اتحاد و تنظیم، ہدف، ایثار و روا داری۔ قوم پستی سے بلندی کی طرف آسکتی ہے، ضعیفی سے شباب کی طرف پلٹ سکتی ہے، قوم یونس کی طرح موت و ہلاکت کے گڑھے سے نکل کر زندگی سے ہمکنار ہو سکتی ہے۔ ہمارا دل کتنا ہی غم واندوہ سے بھرا اور گھٹتا رہے، ہمارے سینے میں ہمیشہ امید کا سمندر موجزن رہنا چاہیئے۔ لیکن امید کے معنی یہ نہیں کہ ہم حالات و حقائق سے ناواقف رہیں یا ان کو نظر انداز کر دیں۔ شتر مرغ کی طرح ریت میں سر چھپالیں، تلخ اور سنگین حقیقتوں سے نگاہیں چار نہ کریں، طفل تسلیوں اور خوش فہمیوں کے سہارے زندہ رہیں، رہزنوں سے اُمیدیں باندھ کر ان کو اپنا رہبر بنالیں، تاریخ اور فطرت کے قوانین سے آنکھیں بند کر کے ہر لحہ یہی مسکّن راگ الاپتے رہیں کہ بس تبدیلی آیا ہی چاہتی ہے۔

تبدیلی کہیں باہر سے نہیں خود ہمارے اندر سے آئے گی، مولانا سید حسن ظفر لکھتے ہیں 'موجودہ حالات نے فکر و عمل کی صلاحیتوں کو سلب کر لیا ہے۔ بدترین حالات اتنی مہلت ہی نہیں دے رہے ہیں کہ ملت کو اس بحران سے نکالنے کیلئے منصوبہ بندی کی جائے جو

کام بھی کیا جارہا ہے وہ ایڈہاک اور عبوری بنیادوں پر کیا جارہا ہے لہذا مستقل وپائیدار نتیجے کا سوال ہی پیدا دنہیں ہوتا، مولانا اسکا علاج یہ تجویز کرتے ہیں 'ہمیں کچھ دیر کیلئے اپنے دل ودماغ کو یکجا ویکسو کرنا ہوگا۔ کچھ وقت کیلئے حالات کی دلدل اور خوش فہمیوں کی جنت سے اپنے آپ کو باہر نکالنا ہوگا۔ عبوری فیصلے کرنے کی بجائے بڑے صبر و تحمل سے از سر نو اپنی صفیں درست کرنی ہوں گی'۔

قوم جن سنگین مسائل اور مہیب خطرات سے دوچار ہے اور جسطرح گرداب (VORTEX) میں پھنسی ہوئی ہے یعنی استحکام، سلامتی، بقاء سب داؤ پر لگے ہوئے ہیں، ہر چیز کے مستقبل پر بے یقینی کے گہرے بادل چھائے ہوئے ہیں کل کیا ہوگا، کوئی یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا، کوئی سنگین سے سنگین بات بھی ایسی نہیں رہ گئی جسکا ہونا ناقابل تصور یا خارج از امکان ہو ہمارا قتل عام ہو سکتا ہے جیسا کہ افغانستان میں ہوا، وقتاً فوقتاً ہمیں موت کے گھاٹ اتارا جائے جیسے کہ پاکستان میں مذہبی دہشت گروہی کے زریعہ ہو رہا ہے، ہم پر عرصہ حیات تنگ کر دیا جائے ہم پر کفر کے اجتماعی فتوے تو لگ ہی چکے ہیں کہیں ایسا نہ ہو فرقہ واریت کے نتیجے میں خون ریزی کی آگ بھڑک اُٹھے، ہر شعبہ حیات میں ہمیں دیوار سے لگایا جارہا ہے مگر ہم ہیں کہ ہمیں احساس بھی نہیں ہے اور سب سے بڑی موت یہی احساس کی موت ہے۔

قوم کی کشتی یقین کے بجائے شک اور، امید اور حوصلے کے بجائے یاس وہراس، اتحاد کے بجائے افتراق ودیانت ووفا کے بجائے بددیانتی، لوٹ کھسوٹ اور بے وفائی کے بھنور

میں پھنسی ہوئی ہے یہ تو قومی زندگی کی مجموعی کیفیت ہے الگ الگ دیکھیں تو کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جسمیں HONESTY OF PURPOSE کے تحت PURPOSE FUL کام ہو رہا ہو، قومی سیاست ہو یا قوم کی اقتصادی صورتحال، تعلیم ہو، اخلاق و کردار ہو جس طرف دیکھئے مفاد ہے، انا پرستی ہے، خود غرضی و حسد ہے، مسابقت وبد نظمی ہے، اتحاد و تنظیم کا فقدان ہے، قائد و قوم میں فاصلے ہیں، محراب و منبر کی آویزش ہے، انصاف و خمس کی وصولیابی کا منظم نظام نہ ہونے کے سبب اسکا ناجائز استعمال ہے، قوم میں علاقائی، لسانی اور نظریاتی عصبیتیں پروان چڑھ رہی ہیں، لالچ و ہوس نے انسان کو حیوان بنا دیا ہے، طبقاتی کشمکش اور سماجی اونچ نیچ بڑھتی جا رہی ہے۔

ہے اور بات لٹیروں کے بس میں ہے تقسیم
وگرنہ دہر کی ہر چیز ہے سبھی کے لئے

یہ سب کچھ اتفاقی حادثہ نہیں ہے یہ صورت حال ایک دن میں پیدا نہیں ہوئی، بر صغیر کی تقسیم کے وقت ہی ہمارے مغربی آقاؤں نے یہ STRATEGY مرتب کرلی تھی کہ مسلمان ہم سے بظاہر آزاد ہو کر بھی باطنی طور پر ہماری غلامی کا طوق اپنے گلے سے نہ اتار سکیں لہٰذا اس نے مسلمانوں میں جو نئے فرقے بنائے تھے وہ ان کے لئے سود مند ثابت ہوئے اور مسلمانوں میں پریشان نظری و پریشان فکری کی آبیاری کیلئے ان فرقوں سے علی

التواتر کام لیا جارہا ہے۔

علاوہ ازیں C.I.A.، موساد، K.G.B. اور اس قسم کی دیگر ایجنسیاں بھی ہمیشہ سرگرم عمل رہیں اور ہو سکتا ہے کہ ان ایجنسیوں نے ہماری ایجنسیز کے لوگ بھی خرید رکھیں ہوں۔ پاکستان میں C.I.A. کا عمل دخل بہت زیادہ ہے اسکا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ 1968ء میں جرمنی میں DR. MEDARD نے ایک چھوٹی سی کتاب "WHO IS WHO IN C.I.A." شائع کی تھی اس کتاب میں امریکی جاسوسی نظام کے پھیلاؤ کی تفصیلات کے علاوہ ان میں تین ہزار C.I.A. ایجنٹوں کے نام اور مختصر سوانحی خاکے بھی دیئے گئے تھے جو کہ 120 ممالک میں مصروف کار تھے۔ پاکستان میں مصروف کار C.I.A. کے ایجنٹوں کی فہرست سب سے طویل تھی جسے برطانیہ کے ایک پاکستانی جریدہ "PAKISTAN LEFT REVIEW" میں بھی شائع کیا تھا اسکا اردو ترجمہ P.I.A. کے محنت کشوں کے ترجمان مجلّہ "منشور" کراچی دسمبر 1969ء کی اشاعت میں مع ان ایجنٹوں کے نام اور ان کے عہدہ کے شائع ہو چکا ہے۔

لہٰذا امریکی C.I.A. کا سب سے بڑا ہدف شیعیانِ حیدر کرار ہیں۔ وہ سمجھ چکے ہیں کہ شیعوں کی کردار سازی کا سرچشمہ مرجعیت ہے اور عزاداری ان میں انقلابی روح بیدار کرتی ہے لہٰذا ایک طرف مذہبی جنونیوں کو خرید کر شیعوں کا قتل عام کروا رہے ہیں یاد رہے بظاہر دہشت گردی کے خلاف ہیں لیکن پوری دنیا کے دہشت گردوں کے حقیقی اور سب سے بڑے سرپرست یہی ہیں۔

دہشت گردی انفرادی بھی ہوتی ہے اور اجتماعی بھی، دہشت گردی ہر میدان میں ہورہی ہے سیاسی دہشت گردی، مذہبی دہشت گردی، جرائم پیشہ افراد کی دہشت گردی اور علمی دہشت گردی۔۔۔۔۔۔ دہشت گردی طاقت و قوت کے بطن سے پیدا ہوتی ہے، ظلم و ستم کی آب و ہوا میں پرورش پاتی ہے، دولت و لالچ کی فضاؤں میں پروان چڑھتی ہے، بے حیائی و بے غیرتی کے اندھیروں میں آنکھ کھولتی ہے، ظلم و شقاوت، تشدد و قساوت، استبداد و بربریت کے گہواروں میں پلتی ہے، عفریت و بہیمیت کے سینوں سے دودھ پی کر جوان ہوتی ہے اور امریکہ و دیگر استکباری و سامراجی قوتوں کے بل بوتے پر ترقی کرتی ہے۔ دور حاضر میں دہشت گردی ایک خطرناک وبائی مرض کی شکل اختیار کر گئی ہے جس نے پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔

سطح آب ہو خشکی یا خلاء بسیط ہر جگہ دہشت گردی کا راج ہے، جن مقامات کو متبرک سمجھا جاتا رہا یعنی (مسجد ہو یا مدرسہ) اور جن ملبوسات کو مقدس سمجھا جاتا رہا یعنی (ٹوپی ہو پگڑی ہو عمامہ و قبا) اب تو وہ بھی دہشت گردی کی آماجگاہ بنے ہوئے ہیں۔ جن کے تقدس کی گہری چھاپ عوام کے دل و دماغ پر مدتوں سے لگی ہوئی ہے اور جن کے تقدس و پاکیزگی کا دنیا صدیوں سے کلمہ پڑھتی رہی ہے۔

یہی تقدس و پاکیزگی تو دہشت گردی کے لئے حجاب و نقاب کا کام کرتی ہے دہشت گردی انہی مقدسات کے پیچھے چھپی بیٹھی رہتی ہے یہ تقدس مآب اب لوگوں کو امن و بھائی چارے کی ترغیب و تلقین کے بجائے دہشت گردی کی تعلیم دیتے ہیں اور مدارس میں بچوں کو

دینی تعلیم دینے کے بجائے انہیں نفرت و عصبیت و فرقہ واریت کی تعلیم دیتے رہیں ہیں BBC نے اس سلسلے میں نمونے کے طور پر ایک مدرسے کی عکس بندی کر کے دنیا کو حیرت میں ڈال دیا کہ وہاں بچوں کو زنجیر میں جکڑ کر رکھا ہوا ہے اور انہیں شب و روز " کافر کافر شیعہ کافر" کا ورد کرایا جاتا ہے اور ان بچوں نے بتایا کہ ہمارے اساتذہ کہتے ہیں کہ ایک شیعہ کو مارنا 70 حج کا ثواب ہے۔

ظاہر ہے کہ کوئی بھی متمدن قوم یا باشعور مسلمان اسے دہشت گردی کے علاوہ کیا نام دے گا۔ان حالات کا مولانا حسن ظفر نقوی نے کیا خوب تجزیہ کیا ہے۔ "مادی خواہشات انہیں شیطانی طاقتوں کا آلۂ کار بنا دیتی ہیں، مدارس کی امداد کی آڑ میں یہ قوتیں ان میں نفوذ پیدا کرتی ہیں اور یہ مال کی چکاچوند سے اندھے ہو کر اپنے دین و ضمیر دونوں کا سودا کر لیتے ہیں اور مال دینے والوں کا آلۂ کار بن جاتے ہیں انسانی بستیوں کی بربادی کیلئے خون آشام بھیڑیئے بن جاتے ہیں۔"

ایک اور جگہ لکھتے ہیں " یہ دنیا پرستوں کا وہ ٹولہ ہے جو دین کے مقدس لباس کی آڑ میں اپنی خواہشاتِ نفسانی کی تکمیل کر رہا ہے اور اس فعل پر بہت خوش ہے کہ کس طرح لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونک رہا ہے"۔

دشمن تو ہمارے خلاف پوری حکمت عملی، پورے منصوبے، پوری نفرتوں اور پورے وسائل کے ساتھ آمادۂ جنگ ہے بلکہ جنگ کا آغاز کر چکا ہے اور ہم ہیں کہ وافر سکّوں اور نوٹوں اور معیار زندگی اور آسائشات کو حاصل کرنے کیلئے اپنی اولاد کے ساتھ اپنے ایمان،

اپنے عقیدے اور اپنے فریضہ دعوت، اپنے جذبۂ انفاق فی سبیل اللہ، اپنے دماغ، اپنی نمازوں روزوں، پردے، شرم، غیرت، روایات، تہذیب، ثقافت اقدار سب مادہ پرستی کی آگ میں جھونک رہے ہیں جو زمانے نے ہر طرف بھڑکا رکھی ہے، رشوت وخیانت، جائز وناجائز، حرام وحلال میں اب تمیز نہیں رہی۔

ہماری قوم میں دوسروں کی طرح جنگ زرگری وانتشار وافتراق واختلاف کا دائرہ بڑھتا جارہا ہے ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ ہم اپنی DEFENCE LINE کو مضبوط کریں ہم اپنی قوم کے ناپسندیدہ افراد کی پگڑی اچھالنے میں مصروف ہیں، اختلاف کے کچھ آداب ہوتے ہیں مہذب افراد پیشہ وربد معاشوں جیسا طریقہ کار اختیار نہیں کرتے اگر ہمیں مردانگی دکھانی ہے تو اپنے دشمن اور حریفوں کو دکھائیں نہ کہ خود آپس میں دست وگریباں ہوں اگر ہم خیال لوگوں کو اس سے آگاہ کر کے اسے اسکے حال پر چھوڑ دیں وقت اسے خود ہی سب کچھ سمجھا دے گا۔

قوم کی کشتی بھنور میں ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ مگر

شیعہ قوم کی کشتی بھنور میں ہے ہمیں اپنی قومی زندگی کا سب سے سنگین بحران در پیش ہے یہ قوم کے کسی داناوبینا شخص سے پوشیدہ نہیں مولانا حسن ظفر نقوی کی" نشان راہ " ایک داناوبینا حکیم کی تدبیر ہے جس پر عمل پیرا ہو کر ایمان واخلاق کی تعمیر کی جاسکے۔ مولانا

نے مرض کے اسباب پر بھی روشنی ڈالی ہے اور اسکا علاج بھی تجویز کیا ہے ہمارے قومی بگاڑ کا سب سے پہلا سبب تعلیم کا ناقص ودوہرا نظام ہے ایک طرف قوم کے نام پر اسکول کھولا جاتا ہے اس کیلئے قوم کے مخیّر حضرات سے DONATION بھی لیا جاتا ہے اور طلباء سے بھاری فیس بھی لی جاتی ہے ظاہر ہے کہ اس صورت میں قوم کے غریب بچے نہ توان اسکولوں کی بھاری فیس دے سکتے ہیں، نہ ٹرانسپورٹ کے اخراجات برداشت کر سکتے ہیں نہ یونیفارم اور کتابوں کے بھاری اخراجات قوم کے نام پر درجنوں کھلے ہوئے اسکولوں میں ایک نام بھی ایسا نہیں ہے جو شیعہ قوم کے غریب بچوں کے لئے کوئی نرم گوشہ رکھتا ہو۔

اگر تعلیم صحیح ہو اور دینی ودنیاوی تعلیم کا امتزاج ہو تو اخلاق وکردار کی تعمیر کی ضمانت ہے اور قوم کی امنگوں اور مزاج کی آئینہ دار ہو تو اسکے قبلے کو صحیح رخ پر پرکھنے کا ذریعہ ہے بد قسمتی سے سب سے زیادہ تغافل بلکہ مجرمانہ تغافل تعلیم ہی سے برتا گیا ہے 53 سال گزر جانے کے بعد بھی شیعہ قوم اپنے تعلیمی ادارے نہ بنا سکی اور صرف 22 فیصد آبادی خواندہ ہے۔

دینی مدارس کی صورتحال افسوسناک ہے پورے پاکستان میں ایک بھی شیعہ مدرسہ ایسا نہیں ہے جسے ہم دیگر فرقوں کے کسی اچھے مدرسہ کہ مقابلے میں پیش کر سکیں جیسا کہ مولانا حسن ظفر نے اسکی نشاندہی کی ہے پاکستان میں بھی ایک حوزہ علمیہ ہونا چاہیئے لیکن حوزہ علمیہ تو درکنار جو مدارس ہیں وہ زبوں حالی کا شکار ہیں اور بیشتر مدارس اپنے بچوں کی کفالت کے لئے کھولے گئے ہیں اور ذاتی ملکیت ہیں۔

☆ قومی بحران کا ایک سبب غربت ہے اور معیار زندگی کی پستی ہے یقیناً فاقہ تک لے جاتا ہے، غربت کا ازالہ ایمان کا تقاضہ ہے، قومی بدحالی سے تفرقہ، انتشار اور خونریزی میں اضافہ ہورہا ہے۔

☆ قوم ٹیکنالوجی اور معاشی ترقی کے لحاظ سے پس ماندہ ہے۔ کاش ہمارے علماء و روساء کبھی اس بارے میں بھی غور فرماتے۔

☆ قومی بحران کا سب سے بڑا سبب ایک باصلاحیت، فعال، مخلص، غیر متعصب، دیندار، بالغ نظر، روشن فکر اور مجرات مند قیادت کا نہ ہونا ہے۔

☆ قومی بحران کا ایک سبب قومی تنظیم، تحریک اور تربیت یافتہ کارکنوں کا فقدان بھی ہے۔

کاش ہم سب ملکر ادارے بناتے کبھی قوم کے ناداروں، بیواؤں، یتیموں، معذوروں کے بارے میں سوچتے، کبھی ان بچوں کے بارے میں سوچتے جن کے ماں باپ انہیں اسکول میں پڑھانے کی پوزیشن نہیں رکھتے اور قوم کے بہت سے ذہین بچے وسائل کی کمی کی وجہ سے اعلی تعلیم سے محروم رہ جاتے ہیں کاش قوم کے پروفیسرز، لیکچررز اور اساتذہ کبھی ان غریب بچوں کیلئے سوچتے اور فری ٹیوشن سینٹر قائم کرتے تاکہ قوم کے وہ بچے جو ٹیوشن فیس نہ دینے کے سبب ٹیوشن نہیں پڑھ سکتے اور اچھے گریڈ سے محروم رہ جاتے ہیں وہ بھی میدان تعلیم میں وسائل رکھنے والوں کی اولادوں کی طرح آگے بڑھتے۔

قوم کے ڈاکٹرز کبھی قوم کے معذوروں اور بیماروں پر بھی چشم کرم فرماتے، کاش

علماء کرام، اور ہم سب ان بچیوں کے بارے میں بھی سوچتے جن کے غریب ماں باپ جہیز نہ دے سکنے کی وجہ سے انکی ڈولی نہیں اُٹھا سکتے، یا ہم جہیز کی لعنت کے خلاف کوئی قدم اُٹھاتے۔ کیا ہم نے کبھی شہداء کے ان بچوں کے بارے میں سوچا کہ کس حال میں ہیں وہ بچے لوریوں کے شہزادے اپنے باپ کے پیار سے محروم ہو گئے کاش ہم انہیں شفقت سے گلے لگاتے، کاش ہم پس دیوار زنداں قوم کے ان گمنام سپاہیوں اور اسیروں کا خیال رکھتے جنہوں نے قوم کی عزت و ناموس کیلئے اپنے مستقبل کو داؤ پر لگا دیا، جنکی مائیں بیدار اور خوابیدہ حالت میں انکے قدموں کی آہٹ محسوس کرتی ہیں اور در زنداں کھلنے کے خواب دیکھتی ہیں، جنکی بہنیں ؟ صبح و شام اپنے بھائیوں کی راہ تکتی ہیں جنکی بیویاں پتھرائی ہوئی آنکھوں سے آتی جاتی راتوں کو دیکھا کرتی ہیں اور ہر آہٹ پر یہ سمجھتی ہیں کہ انکی جدائیوں کے دن شاید ختم ہو گئے۔

کیا ان کے بچے ان سے سوال نہ کرتے ہوں گے کہ ماں بابا کب آئیں گے قوم جواب دے کہ وہ دکھی اور غمزدہ ماں اپنے بچے کو کیا جواب دے اور کب تک لفظوں سے بہلاتی رہے۔ ہمیں ان باتوں کا احساس اس لیئے نہیں ہے کہ ہم اس طوفان سے نہیں گزرے ہیں ہم پر یہ قیامت نہیں ٹوٹی ہے ہم اس کرب سے دوچار نہیں ہوئے ہیں لیکن یہ قیامت کبھی اور کسی وقت کسی پر ٹوٹ سکتی ہے نہ جانے تقدیر کب ہمیں ہمارے بچوں سے جدا کر دے کسی کو نہیں معلوم اگر ہم خود کو اس جگہ رکھ کر سوچتے تو اتنے بے حس نہ ہوتے مگر جس قوم میں تصور قیامت نہ ہو، احساس مر جائے، صلہ رحمی مفقود ہو جائے، اپنا کوئی تعلیمی تصور نہ ہو اور کوئی تہذیبی نقشہ نہ ہو اور کوئی قیادت نہ ہو اور کوئی تربیت نہ ہو تو اسکے یہاں میدان کھلا ہے جسکا

جی چاہے ہمیں روند ڈالے، جسکا جی چاہے جس قسم کے خیالات و عقائید چاہے قوم میں پھیلائے کوئی احتساب اور روک ٹوک اور امتناع نہیں ہے۔

جہاں عقائد کی جنگ زوروں پہ ہو جہاں دنیاوی اداروں کے ساتھ ساتھ دینی اداروں میں بھی کھانے پینے کا کاروبار شروع ہو جائے جہاں محراب و منبر میں آویزش ہو جہاں علماء و ذاکرین الگ الگ سبق پڑھا رہے ہوں ، جہاں ایک منصوبے کے تحت جہلا کو دستارِ فضیلت پہنا کر منبروں پر بٹھادیا گیا ہو بلکہ مسلط کردیا ہو ، جہاں مذہب ایک منفعت بخش کاروبار ہو عزداریِ سید الشہداء تجارتی ادارہ بن جائے، جہاں قوم کا Moral Down ہو چکا ہو، خوف و ہراس طاری ہو جہاں کوئی کسی کا پرسان حال نہ ہو ایک دوسرے سے بیگانہ ہو، ایک دوسرے کا احترام چھوڑ دے ایسی خستہ حال و بے چارگی اور جمود و جزام کا عالم جہاں طاری ہو وہاں لوگ کسی تحریک یا کسی مطالبے کے لئے کیسے کھڑے ہو سکتے ہیں ؟

مولانا سید حسن ظفر نقوی کی کتاب نشانِ راہ میں ایک مقصدیت کار فرما ہے انہوں نے بڑے قابل قدر جذبہ کے ساتھ یہ کام انجام دیا ہے، جو قومی درد رکھنے والے، نظریاتی، صاحب دل، صاحب نظر، صاحب تقویٰ افراد اور سنجیدہ قاری کے لئے ایک قیمتی سرمایہ ہے۔ مولانا ایک سیماب صفت ، بے چین اور مضطرب روح کے مالک ہیں، ان کی تحریر میں درد، دعوت بے قراری پائی جاتی ہے۔ ان کے اسلوب بیان میں سنجیدگی بھی ہے اور دلکشی و جاذبیت بھی انہوں نے قوم کے بے لاگ مبصر کا کردار انجام دیا ہے، اور قومی حالات کا ایک متوازن اور غیر جانبدارانہ تجزیہ پیش کیا ہے اور صرف تنقید و تبصرہ و تجزیہ پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ ٹھوس تجاویز بھی پیش کی ہیں۔ جو موضوعات مولانا نے خوف فساد خلق کی

وجہ سے یا سہواً چھوڑ دیئے تھے میں نے بر سبیل تذکرہ انکی نشاندہی کردی ہے، امید ہے کہ مولانا آئندہ بھی اس قسم کے انتہائی ضروری موضوعات پر قلم اٹھاتے رہیں گے اگر ہر شخص مصلحت گزیدہ یا بے حس ہو گیا تو حسینی کردار کون انجام دے گا کسی کو تو توفیق ہوئی کہ اس صحرا میں اذان دے، کسی نے تو حرف حق کہا، سلام اس پر جو حق کو قبول کرے۔

والسلام

آلِ محمد رزمی

کراچی

پروفیسر محمد محسن نقوی

ہمدرد یونیورسٹی کراچی۔

ملی۔ایڈ کالج کراچی۔

نشان راہ کی جانب!

حجۃ الاسلام مولانا سید حسن ظفر نقوی کا تعلق ایک علمی و ادبی گھرانے سے ہے مولانا کی تقریر کے ہم دیرینہ مداح ہیں، لیکن انکی تحریر کے جوہر سے ہم نا آشنا تھے۔ مولانا موصوف کی پہلی کتاب "امیر مختار" کے مطالعے سے انکی عمیق نگاہی کا پتہ تو چلتا ہے لیکن انکے تحریری قدو قامت، زیبائی، اسلوب نگارش، اور سوچنے کے انداز کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا تھا۔ زیر نظر کتاب "نشانِ راہ" کو پڑھنے کے بعد اندازہ ہو کہ مولانا حالاتِ حاضرہ اور قومی مسائل سے آگاہی اور روشناسی رکھتے ہیں اور اپنے پہلو میں ایک حساس اور درد مند دل رکھتے ہیں۔ اور پیشہ ور خطیب نہیں بلکہ بالغ نظر اور روشن فکر خطیب ہیں۔

آپ نے قومی حالات کی ترجمانی، عکاسی اور آئینہ گری بڑی جرأت و بے باکی سے کی ہے۔ اگرچہ مولانا محترم نے بے شمار سخن ہائے گفتنی خوفِ فسادِ خلق کی وجہ سے ناگفتہ رہنے دیئے۔ تاہم انہوں نے جرأتِ اظہار کی موت کو خود گلے لگا کر سنت میثم و بوذر کو زندہ کیا۔ لہٰذا انہیں میثم و بوذر ہی کی طرح وقت کی خاردار راہوں پر چلنے کے لئے آمادہ رہنا چاہیئے۔

کوئے قاتل میں صدا دینے کا انجام دار و رسن کی آزمائش ہے۔ اب وہ قوم و قومیات، اور درباری ملا اور بعض بازاری خطباء کا ہدفِ ملامت بننے کے لئے تیار رہیں۔ مولانا نے جن مسائل کی نشاندہی کی ہے یہ وہ پیش پا افتادہ حقیقتیں ہیں اور BURNING IS-SUES ہے جس سے انکار کرنا حقیقت سے انحراف ہے۔ اور یہ حرف نا ملائم اور یہ کڑوی گولیاں قوم کو کسی نہ کسی مرحلے پر نگلنا ہی پڑیں گی۔ تو کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ متوقع طوفان سے پیشتر ہی قوم اپنے حفاظتی پشتوں کو مضبوط کر لے۔ کیونکہ طوفان کی صورت میں انسان کو خود اپنی جان بچانے کی فکر لگی رہتی ہے۔ اور وہ خود غرضی کی اس منزل پر پہنچ جاتا ہے کہ اسے اپنے متعلقین اور لواحقین کا دھیان بھی نہیں رہتا ہے۔

مولانا کا ایک ایک جملہ صداقت پر مُبنی اور حقیقت کا ترجمان ہے۔ انکی صاف گوئی کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ انہوں نے اپنی صنف کی وکالت نہیں کی بلکہ شدید ناراضگی کا خدشہ بھی مول لیا ہے۔ لیکن لب و گوش پر خاموشی سجا کر بدلتے سیاسی و قومی موسموں سے چشم پوشی سے بہتر ہے کہ وہ دنیا کی نگاہوں میں ہدفِ ملامت بن جائیں، لیکن اسطرح وہ بارگاہِ معصومینؑ میں یقیناً سرخرو ہو جائیں گے۔

اگر ہر شخص مصلحت کوشی کے طوفان میں بہہ جائے گا، مفاد کی خاطر خاموش رہے گا، مال و زر کے لالچ میں چشم پوشی کرے گا تو باڑھ پر آئی ہوئی یزیدیت، ناصبیت، خارجیت اور لادینیت کے خلاف بند کون باندھے گا۔ عصر حاضر کی اس کربلا میں حسینؑ کے ماننے اور چاہنے والوں کو کب تک موت کی نیند سلایا جاتا رہے گا۔ اور کب تک ہم جنازوں پر

جنازے اٹھاتے رہیں گے۔ اور کب تک ہمارے قائدین ان بے گناہوں کے جنازے پڑھاتے رہیں گے۔

ہم ایک مہذب قوم ہیں، جو پر امن بقائے باہمی، اتحاد بین المسلمین اور رواداری پر پورا یقین رکھتے ہیں تاہم ہمیں اپنے دفاع کا شرعی اختیا حاصل ہے اور بد قسمتی سے قوم و قیادت نے اس کے لئے اب تک کوئی حکمت عملی تیار نہیں کی۔ مولانا نے اپنی کتاب "نشانِ راہ" میں جن جن موضوعات پر قلم اٹھایا ہے، ایک ایک موضوع غور طلب اور تصفیہ طلب ہے۔ مولانا کی یہ تجاویز انتہائی مناسب ہیں کہ ہر ادارے سے نمائندہ منتخب کر کے علاقائی کونسل بنائی جائے۔ لیکن اس سے قبل تمام اداروں، ماتمی انجمنوں، اسکاؤٹس گروپوں، رفاعی وسماجی تنظیموں، مساجد وامام بارگاہ کے ٹرسٹیز، دانشوروں، قوم کے بیوروکریٹس، ریٹائرڈ افسران، صحافی، وکلاء، ماہرینِ تعلیم، اطباء، سیاستدان، صنعت کار، زمیندار، اور قوم کے دیگر طبقات کی نمائندہ شخصیات کا ایک نمائندہ اجلاس بلایا جائے اور ان نمائندوں سے علاقائی کونسل منتخب کی جائے علاقائی کونسل کے نمائندوں سے مرکزی کونسل تشکیل دی جائے۔ مرکزی کونسل سے ایک پانچ رکنی نگراں کمیٹی بنائی جائے۔ اور علاقائی اور مرکزی کونسل ووٹنگ کے ذریعے تین سال کے لئے سربراہ کا انتخاب کرے۔

یہ قوم کا حق ہے کہ وہ ملکی حالات کے پیش نظر مذہبی اور قومی مفادات اور سیرتِ ائمہؑ کو مدِ نظر رکھتے ہوئے دیگر طبقات، مکاتب اور جماعتوں سے تعلقات قائم کرے۔ فضول محاذ آرائیوں سے اجتناب کرے۔ افہام و تفہیم کے ذریعے قوم کے نمائندے

دیگر جماعتوں اور حکومت سے مذاکرات کریں اور پاکستان کے ذمہ دار، پرامن اور وفادار شہری کی حیثیت سے اپنے حقوق طلب کریں تاکہ انفرادی طور پر قوم کی نمائندگی کا ڈھول پیٹ کر حکومت سے مفادات حاصل کرنے والوں کا راستہ روکا جاسکے۔ ماضی میں ایک مشہور خطیب نے اپنی مجلس میں فرمایا تھا کہ "کرسی تمہیں مبارک ہو اور آیۃ الکرسی ہمیں مبارک ہو" لیکن تیسرے دن وہ ضیاء الحق کی مجلسِ شوریٰ میں جا بیٹھے۔ اور پھر تادمِ مرگ اس ڈکٹیٹر کی مدح سرائی میں مصروف رہے۔

دیکھنے میں یہ آیا ہے کہ جسے حکومت سے کوئی عہدہ یا مراعت نہیں ملتی وہ حکومت کے خلاف بیان بازی شروع کر دیتا ہے اور جیسے ہی کوئی عہدہ یا پلاٹ پرمٹ مل جاتا ہے وہ حکومت کی تعریف و توصیف میں زمین و آسمان کے قلابے ملانے لگتا ہے۔ لہٰذا ہمیں قومی سطح پر سوچنا ہے اور تمام نجی اور فروعی اختلافات بھلا کر نئے سرے سے سفر کا آغاز کرنا ہے۔ میں مولانا حسن ظفر نقوی کی تحریر سے یہی نتیجہ اخذ کر سکا ہوں اور میرا خیال ہے کہ ہر اہلِ فکر و دانش مولانا کی تحریر سے اسی نتیجے پر پہنچے گا اور اسکی تائید کرے گا۔ خدا ہماری قوم کو درپیش مسائل سے محمد و آلِ محمدؐ کے صدقے میں نجات دے۔

والسلام۔

محمد محسن نقوی

بی۔ ایڈ۔ کالج، کراچی۔

اظہارِ تشکّر

شکریہ ادا کرنے سے پہلے ضروری سمجھتا ہوں کہ وجہِ تالیف بھی بیان کرتا چلوں۔

جس موضوع پر میں نے قلم اٹھایا ہے، یہ کوئی اچھوتا یا انوکھا موضوع نہیں ہے، بلکہ اس سے پہلے بھی بہت سے افرادِ ملّت اس موضوع پر کتابیں، مضامین اور مقالے شائع کر چکے ہیں۔ مگر کتابوں کی ضخامت اور مضامین اور مقالہ جات کی موضوع کے اعتبار سے محدودیت نے مجھے ابھارا کہ ایک ایسی تحریر ہونی چاہئے جو ایک طرف تو ضخامت کے اعتبار سے اکتادینے والی نہ ہو، اور دوسری طرف تمام مسائل کا احاطہ بھی کر لے۔

اسی فکر کے پیشِ نظر میں نے کتاب کو مختصر رکھا ہے تاکہ پڑھنے والا اسے ایک ہی نشست میں پڑھ ڈالے، اور اسکا ذہن درپیش مسائل سے اجمالی طور پر ہی سہی آگاہی بھی حاصل کر لے۔

اب میں اپنی اس کوشش میں کہاں تک کامیاب ہو سکا ہوں اسکا فیصلہ تو پڑھنے والے ہی کر سکیں گے۔ خصوصاً میری اپنے جوان دوستوں سے اپیل ہے کہ وہ اس تحریر کو پڑھنے کے بعد مجھے اپنی رائے سے ضرور آگاہ کریں۔

میں خاص طور پر حجۃ الاسلام والمسلمین حضرت مولانا ابنِ حسن کربلائی دام ظلہ العالی کا ممنون و متشکر ہوں کہ جنہوں نے بزرگی کا مظاہرہ فرماتے ہوئے اپنے خاص لطف و کرم سے میری تحریر کا لفظ بہ لفظ مطالعہ کیا کچھ زبان کی خامیوں کی اصلاح کی اور اپنی قیمتی رائے دے کر نہ صرف یہ کہ میری حوصلہ افزائی فرمائی بلکہ میری تحریر کو اعتبار بھی عطا کر دیا۔ خدا ان کا اور ان جیسے علمائے باعمل کا سایہ ملّت کے سر پر تادیر قائم رکھے۔

اور پھر اپنے دوست آلِ محمد رزمی کا شکر گزار ہوں کہ جنہوں نے میری بڑی مشکل حل کر دی اور بعض ایسے مطالب جن کی تشریح کرنا میرے لئے ایک مشکل کام تھا ان مطالب کی تشریح برادر آلِ محمد رزمی نے اپنی تحریر میں کر ڈالی اور میرے شریک جرم بن گئے۔

محترم و مکرم جناب پروفیسر محسن نقوی دامۃ افاضاتہ کا بھی شکر گزار ہوں، کہ آپ نے ایک دانشور کی حیثیت سے اس تحریر کو پسند کیا اور اپنی رائے تحریری صورت میں بھیجی۔

اس کے علاوہ ان حضرات کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں کہ جنہوں نے اس تحریر کو پڑھا اور پھر خوفزدہ ہو کر تحریری تعاون سے انکار کر دیا۔ شاید اس آئینے میں انہیں اپنا بھی چہرہ نظر آگیا ہو۔ ان حضرات کا شکریہ اس لئے ادا کر رہا ہوں کہ اب تک ان شخصیتوں کے بارے میں شکوک و شبہات پائے جاتے تھے مگر اب وہ ہر قسم کے شک و شبہہ سے بالاتر ہو چکے ہیں۔

اے، بی پرنٹرز کے برادران کا شکریہ کہ جن کے سر پر میں بری طرح مسلط ہو گیا تھا اور بالآخر کتاب میری مطلوبہ مدت میں کمپوز ہو ہی گئی۔ العصر کے برادر امتیاز جنہوں نے

میرے ذہن کے مطابق کتاب کا سرورق تیار کیا۔

ان کے علاوہ بھی ان تمام احباب کا شکریہ جو قدم قدم پر میری حوصلہ افزائی فرماتے رہے۔ مجھے یقین ہے کہ کچھ اطراف سے شور و غوغا ضرور بلند ہوگا۔ مگر ان کے لئے اقبالؔ کے اس شعر کے ذریعے جواب حاضر ہے۔

حریف اپنا سمجھ رہے ہیں ، مجھے خدایانِ خانقاہی
انہیں یہ ڈر ہے کہ میرے نالوں سے شق نہ ہو سنگِ آستانہ

احقر العباد

حسن ظفر نقوی

اگست / ۲۰۰۰ء ، کراچی۔

❀ ❀ ❀

کیا کیا جائے ؟۔

ہمارا سفر طویل، صبر آزما اور تھکا دینے والا ہے۔ ہمارے سامنے مسائل کا انبار ہے۔ مہیب اور گھمبیر مسائل بظاہر ایسا لگتا ہے کہ جیسے یہ مسائل اچانک ہی ہماری قوم پر آپڑے ہیں جس کے لئے لوگ پہلے سے تیار نہ تھے اور نہ ہی اِن حالات کا سامنا کرنے کے لئے کوئی پیشگی منصوبہ بندی کی گئی تھی۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ اِن مشکلات اور مسائل کی جڑیں کم از کم ایک صدی پیچھے پیوست نظر آتی ہیں۔ ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ جب اِن مسائل اور مشکلات کے بیج بوئے جارہے تھے اور استعمار بڑی ہی ہوشیاری اور چابک دستی سے ہندوستان کی سرزمین پر نہ ختم ہونے والے فتنہ و فساد کی داغ بیل ڈال رہا تھا اور بنیادیں مضبوط کر رہا تھا اُسی وقت سے اِس فتنہ و فساد کی جڑیں کاٹنے کے لئے منصوبہ بندی ہونا چاہیئے تھی مگر لاشعوری طور پر مذہبی قوتیں سامراجی عزائم کو کامیاب کرنے کا باعث بنتی چلی گئیں۔

سامراج تقسیم در تقسیم کے اصول پر عمل پیرا رہا اور یہ عمل صرف سرحدوں کی

تقسیم پر نہیں رکا بلکہ تقسیم شدہ زمینوں میں، علاقائیت، لسانیت اور فرقہ واریت کے روپ میں پروان چڑھتا رہا اور آج ایک مضبوط اور تناور درخت کی صورت میں اس خطے پر اپنے منحوس اور شیطانی سائے کی ظلمتیں پھیلاتا چلا جارہا ہے اور اس سرزمین کا کوئی بھی گلی کوچہ ایسا نہیں جہاں اس شجرِ خبیثہ کی کوئی شاخ سایہ فگن نہ ہو اور اُسے اپنے آسیب سے متاثر نہ کر رہی ہو۔

موجودہ حالات نے فکر و عمل کی صلاحیتوں کو سلب کر لیا ہے۔ بدترین حالات اتنی مہلت ہی نہیں دے رہے کہ ملّت کو اِس بحران سے نکالنے کے لئے منصوبہ بندی کی جائے۔ جو کام بھی کیا جارہا ہے وہ ایڈہاک اور عبوری بنیادوں پر کیا جارہا ہے۔ لہٰذا مستقل و پائیدار نتیجے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

ہمیں کچھ دیر کے لئے اپنے دل و دماغ کو یکجا و یکسو کرنا ہوگا۔ کچھ وقت کے لئے حالات کی دلدل اور خوش فہمیوں کی جنت سے اپنے آپ کو باہر نکالنا ہوگا۔ عبوری فیصلے کرنے کی بجائے بڑے صبر و تحمّل سے از سرِ نو اپنی صفیں درست کرنی ہونگی۔ بلکہ یہ مان کر کہ صفیں ہیں ہی نہیں اپنے سامنے ایک صفر لگانا ہوگا۔ یہ بڑا صبر آزما مرحلہ ہے صبح و شام بدلتے حالات ہمیں مسائل میں کود جانے کے لئے پکاریں گے۔ لوگوں کی فریادیں ہمیں اپنی طرف متوجہ کریں گی۔ لیکن ہمیں یہ تسلیم کر لینا پڑے گا کہ ہم نہ صرف یہ کہ ایک منتشر معاشرے کی کوئی مدد نہیں کر سکتے بلکہ ان حالات میں کود کر کچھ کر سکنے کی صلاحیت سے بھی محروم ہو سکتے ہیں۔

اس کی تشریح کی ضرورت ہے۔ قومیں چند سالوں میں بنتی یا بگڑتی نہیں ہیں۔ تاریخ اقوام یہی بتاتی ہے کہ یہ صدیوں کا عمل ہے۔ سیکڑوں سال ظلم و ستم کی چکّی میں پسنے والی قوم بالآخر Survive کرتی ہے اور آخر کار ایک قوت کی صورت میں ابھرتی ہے۔ صدیوں تک دنیا کے بڑے حصّے پر حکمرانی کرنے والی قومیں آخر کار تاریخ کے پہیئے کے چکر میں آکر زوال کا شکار ہو جاتی ہیں۔ کسی خاص قوم کی مثال دینے کی ضرورت نہیں تاریخ کے صفحات پر بے شمار مثالیں ثبت ہیں۔

ہمارے ایک گروہ کو بالآخر یہ ذمہ داری لینا پڑے گی کہ وہ بظاہر اپنے اوپر بے حسی طاری کر لے اور کسی بھی طرح حالات کے موجودہ دھارے سے اپنے آپ کو باہر نکالے اور اپنے لئے ایک پناہ گاہ تلاش کر لے۔ یہ پناہ گاہ اپنی جانیں بچانے کے لئے نہیں بلکہ آئندہ نسلوں کے مستقبل کو محفوظ کرنے کے لیئے "غارِ حرا" کا کام دے۔

ایسی ہی ایک پناہ سب سے پہلے عبدالمطلبؑ نے فتنہ و فساد سے دوری اختیار کر کے حاصل کی اور اس فکری پناہ گاہ میں برسوں تک اپنی قوم کی حالت پر کفِ افسوس ملنے کے ساتھ ساتھ دل و دماغ کے دریچے کھول کر قوم کے مستقبل کے بارے میں سوچتے رہتے تھے۔ یہ فکرِ عبدالمطلبؑ صرف غار تک محدود نہ رہی بلکہ جب یہ غار سے باہر نکلی تو عبدالمطلبؑ اپنے بیٹوں پر مشتمل ایک چھوٹا سا تربیت یافتہ گروہ تشکیل دینے میں کامیاب ہو گئے۔ جو آنے والے کل میں عباسؑ، حمزہؑ، ابو طالبؑ اور عبداللہؑ اور ان کی اولادوں کی صورت میں نقیب انقلابؐ کو قوت فراہم کریں گے اور برسوں پر محیط عبدالمطلب اور ابو طالبؑ کی زحمتیں رنگ

لاکر رہیں گی اور جب وہ منجیٰ بشریتؑ فتنہ و فساد کے شجر خبیثہ کی جڑوں پر حملہ کرے گا تو پروردگار اُسے حیدر کرارؑ کی شکل میں اپنے ضیغم کی نعمت عطا کرے گا۔

اللہ کی مدد حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے خود کچھ اقدامات کیے جائیں۔ پہلے خود اپنے حالات بدلنے کے لئے قدم بڑھائے جائیں۔ لیکن از حد ضروری ہے کہ یہ غور و فکر کرنے والا گروہ غارِ حرا تلاش کرنے والا گروہ مخلوق خدا کی محبت سے سرشار ہو، خدا کی رسی کو مضبوطی سے تھامے ہوئے ہو، عشق رسولؐ میں ڈوبا ہوا اور میخانہ کربلا کا جام پیئے ہوئے ہو۔ جس کا کبھی نہ اترنے والا خمار اُسے جادہ حق پر گامزن رکھنے کے لئے ضروری ہے۔

ایسے افراد کی تلاش اور انھیں یکجا کرنا مشکل ترین مرحلہ ہے مگر ناممکن نہیں۔ ایسے افراد کسی خاص طبقے میں نہیں بلکہ ہر طبقے میں موجود ہیں اور اُن کا ہر طبقے میں نفوذ ضروری ہے۔ تلخ ماضی یہ بتاتا ہے کہ مختلف طبقات کو نظر انداز کرنے کے بھیانک نتائج سامنے آئے۔

دانشور طبقہ کسی بھی قوم کے ارتقاء میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے۔ ادیب، شاعر، طبیب، قانون داں، معلّم، فلسفی وغیرہ یہ سب مل کر کسی معاشرے اور قوم کی تشکیل اور ترقی میں اہم ترین کردار ادا کرتے ہیں۔ لیکن ذرا گذشتہ نصف صدی پر نظر ڈالئے تو آپ کو نظر آئے گا کہ اُن کی فکری صلاحیتوں کو ملّت کی تعمیر کے بجائے سربراہانِ وقت کی خدمات کے لئے وقف کر دیا گیا اور جو اپنے ضمیر کا سودا کرنے پر تیار نہ ہوا، اُس کی آواز اُس کے گلے ہی میں گھونٹ دی گئی یا اتنی نحیف کر دی گئی کہ خود اُسے بھی اپنی آواز اجنبی محسوس

ہونے لگی۔

آغاز کیسے کیا جائے ؟۔

مسائل کی نشاندہی بہت آسان مگر اُن کا قابلِ عمل حل پیش کرنا بڑا مشکل کام ہے۔اس ضمن میں پہلی بات یہ ہے کہ جب تک ہم مسائل کی جڑ کو نہ تلاش کرلیں ہم اُن پر قابو پانے کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔جب تک اپنے دشمن کی شناخت حاصل نہ کرلیں اُسے شکست دینے کا خیال بھی احمقانہ ہے۔ ہمارا اصل دشمن وہ نہیں ہوتا جو ہم پر گولی چلاتا ہے یا ہماری بستیوں کو تاراج کرتا ہے۔بلکہ اصل دشمن وہ ہوتا ہے جو اُس سے گولی چلوا رہا ہوتا ہے اور آگ لگوا رہا ہوتا ہے۔

دشمن کی شناخت :۔

بس جدوجہد کی راہ پر قدم بڑھانے سے پہلے ہمارے لئے دشمن کو پہچاننا اور اُس کے متعلق تمام معلومات کا حاصل کرنا ضروری ہے۔ در پیش حالات میں انسانیت کو جہنم کی طرف دھکیلنے والے شیطان کے یہ آلہ کار تہہ در تہہ پردوں اور نقابوں کے پیچھے چھپ کر بیٹھ گئے ہیں۔ ہمارے معاشرے کو جہنم کے دہانے تک پہنچانے کے لئے سامراج نے کچھ

عفریتوں کو ہم پر مسلط کیا اور ظلم تو یہ ہے کہ اِن سانپوں بلکہ اژدہوں کو ہمارے ہی ہاتھوں دودھ پلوایا اور بظاہر ہم خود ہی ان کے طاقتور اور آگ برسانے والے اژدھا بنانے کا موجب بنے۔

پہلا عفریت :۔ فرعونیت کے وارث جاگیردار، جو زمین پر ربوبیت کے دعویدار بن کر اپنے آپ کو انسانیت کے دائرے سے خارج کرنا اور انسانوں کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑنا اپنا حق سمجھتے ہیں۔ زمین جتنا بھی سونا اگلے وہ ان کی ملکیت اور ان کے شہزادوں اور شہزادیوں کے روزو شب کو رنگین تر بنانے کے لئے یا پھر ایوانِ اقتدار کی غلام گردشوں میں اپنی راہداریوں کو صاف رکھنے کے لئے وقف ہے تاکہ اِن کی جاگیروں پر رینگنے والے کیڑے مکوڑوں پر جن کے خون پسینے سے یہ زمین سونا اگلتی ہے اپنے رعب و جلال کا سکہ بٹھایا جا سکے اور جب یہ فرعون اعلان کریں کہ " انا ربکم الاعلیٰ " تو یہ کیڑے مکوڑے نما مخلوق ان کے سامنے سجدے میں چلی جائے۔

یہ جاگیردار دراصل سامراج کی غلامی کے صلے میں حاصل کی ہوئی جاگیروں کے مالک ہی نہیں بلکہ اس کے تمام شیطانی ہتھکنڈوں کے وارث بھی ہیں۔ یقیناً ان میں کچھ افراد اپنے ہی سسٹم کے باغی ہوتے ہیں مگر یا تو وہ گمنامی میں زندگی بسر کر دیتے ہیں یا پھر اپنے ہی خاندان کے افراد کے ہاتھوں موت کی نیند سلا دیئے جاتے ہیں کیونکہ اپنی جاگیرداری کی حفاظت کرنے والے اپنے سسٹم کے لئے کوئی خطرہ برداشت نہیں کر سکتے، چاہے وہ خونی

رشتہ ہی کیوں نہ ہو۔

دوسرا عفریت :۔ ہامانی بیوروکریسی جو اللہ کی مخلوق پر فرعونوں کو مسلط کرنے کی ذمہ دار ہے۔ فرعون بدلتے رہتے ہیں مگر یہ اپنی جگہ مضبوطی سے قائم رہتے ہیں۔ انھیں اپنے آپ کو مضبوط رکھنے کا فن آتا ہے۔ حکمرانوں کے لئے زندہ باد اور مردہ باد کے نعرے لگانے والے سادہ عوام یہ نہیں جانتے کہ عوام کا خون چوسنے والی عفریت دراصل بیوروکریسی ہے جو ایک طرف حکمرانوں کو یہ باور کراتی ہے کہ اُن سے زیادہ حکومت کا وفادار کوئی نہیں ہے۔ اسی خونخوار بیوروکریسی کی سامراج نواز پالیسیوں پر حکمران عملدر آمد کرتے ہوئے بے چارے اور بے کس عوام پر قہر ڈھاتے ہیں۔ دوسری طرف یہ بیوروکریٹس عوام کے سامنے مظلوم بن جاتے ہیں کہ وہ قصوروار نہیں ہیں بلکہ وہ حکمرانوں کے احکام کا اجراء کر رہے ہیں۔

کرپشن پھیلانے میں سب سے زیادہ ہاتھ اسی بیوروکریسی کا ہوتا ہے۔ غیر ملکی قرضے لینے اور ہڑپ کرنے کے یہ ماہر افراد جب تک حکمران طبقے میں کرپشن پیدا نہ کریں اس وقت تک یہ خود اپنے خزانوں میں اضافہ نہیں کر سکتے۔ اس لئے پہلے یہ خود حکمران خاندان اور وزیروں مشیروں کو کرپشن کے راستے سمجھاتے ہیں۔

لیکن سوال یہ ہے کہ یہ ایسا کیوں کرتے ہیں ؟ اس کی چند وجوہات ہیں۔ پہلی وجہ تو وہ شیطانی نظام ہے جو سامراج ہمارے سر تھونپ گیا ہے۔ اس نظام میں بیوروکریسی ان ہی

کی تربیت یافتہ یاان ہی کے خطوط پر تربیت حاصل کرنے والی ہے جو اپنی سرزمین اور اپنی قوم سے زیادہ اپنا ناطہ انگریزوں سے جوڑنے کو فخر جانتی ہے۔ان کا رہن سہن، اٹھنا بیٹھنا، بچوں کی انگریزوں کی گود میں تربیت، چھٹیاں یورپ کے حسین ساحلوں پر گذارنا، مصیبت میں ملک چھوڑ کر فرار ہونے کے لئے ہر وقت پر تولے تیار رہنا ہے۔ دوسری وجہ بے دینی ہے یہ ان کی تربیت کا خاصہ ہے کہ ان کا کوئی دین نہیں ہوتا، ان کا دین، مذہب، عقیدہ سب ان کی کرسی اور ان کا مفاد ہوتا ہے۔ اسی لئے یہ اپنے ملک کے بجائے استعماری طاقتوں کے مفادات کا تحفظ کرتے ہیں۔ ثبوت یہ ہے کہ اپنے عوام کا خون پانی کی طرح بہہ جائے، ان پر کوئی اثر نہیں ہوتا لیکن اگر ان کے آقاؤں مثلاً امریکہ یا برطانیہ کے سفارت خانوں یا اُن کے ملازمین کو کوئی جھوٹی دھمکی بھی دی جائے تو پھر آپ ان کی فکر مندی اور پریشانی دیکھئے۔ اصل میں یہ ان ہی ملکوں کے سفارتخانوں کے وفادار اور نمک خوار ہیں۔

یقیناً ان میں استثنائی افراد مل جائیں گے جو نہایت خلوص اور جذبہ خدمت کے ساتھ اور اس نظام کو بدل دینے کی آرزو کے ساتھ تربیت حاصل کر کے اس سسٹم میں داخل ہوتے ہیں لیکن انھیں جلد ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہ کس شیطانی چکر میں آچکے ہیں مگر ایسے مخلص افراد کی تعداد اتنی ہی ہوگی جتنی پولیس کے محکمے میں ایماندار افراد کی بلکہ شاید پولیس میں زیادہ فرض شناس افراد مل جائیں گے مگر بیوروکریسی جو تہہ در تہہ پردوں میں چھپ کر کام کرتی ہے اُن میں یہ تعداد اس سے بھی کم ہو۔

تیسرا عفریت :۔ جرائم پیشہ سیاست دان :

اسمگلروں، چوروں، ڈاکوؤں، قاتلوں اور لٹیرے سرمایہ داروں کی بہترین پناہ گاہ سیاسی جماعتیں۔ پہلے یہ ہوتا تھا کہ یہ جرائم پیشہ افراد سیاسی افراد اور سیاسی جماعتوں کو فنڈز فراہم کرتے تھے تاکہ بُرے وقت میں یہ سیاسی جماعتیں ان کی سرپرستی کریں یا برسرِ اقتدار آکر انھیں لوٹ مار کرنے میں مزید مراعات فراہم کریں مگر اب یہ سارے جرائم پیشہ افراد خود ہی سیاستدانوں کے روپ میں آکر سیاسی جماعتوں میں شمولیت یا نئی سیاسی جماعتوں کی تشکیل کے ذریعے اپنے مجرمانہ کاروبار کو محفوظ کر لیتے ہیں۔ اس کی زیادہ وضاحت کی ضرورت نہیں۔ ہیروئن کا کاروبار ہو یا اسلحہ کا، ٹیکس چوری اور کسٹم ڈیوٹی بچانے کا مسئلہ ہو یا بینکوں کا قرضہ ہڑپ کرنے، ایجنسیوں کے حصول کا مسئلہ ہو یا بڑے بڑے ٹھیکوں کا سب جگہ ان کا راج ہے اور پورے ملک میں ہر شعبے میں ان کا شیطانی رقص جاری ہے۔

وقتی طور پر ہی سہی لیکن جب ایک چوروں کا ٹولہ جاتا ہے اور دوسرا چوروں کا گروہ اس کی جگہ سنبھال لیتا ہے تو پچھلے والوں کے کارنامے ضرور سامنے آتے ہیں اور کبھی کبھی تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ یہ سارے چور کسی مشترکہ مفاد پر ہم آواز ہو جاتے ہیں۔ ایسی ایک مثال بے نظیر دور میں اس وقت سامنے آئی جب ڈیوٹی فری لگژری کاروں کا معاملہ ہوا۔ تمام ارکانِ پارلیمنٹ کو یہ سہولت دی گئی کہ وہ لگژری کار بغیر ڈیوٹی ادا کیے حاصل کر سکتے ہیں اور اُس کار کی صرف ڈیوٹی لاکھوں روپے بنتی تھی تو پھر اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ کار کیا ہو گی۔ اس مسئلے پر وہ ارکانِ اسمبلی بھی جو صبح شام اسمبلی میں بے نظیر حکومت کے خلاف اُدھم مچاتے رہتے تھے

اور عوام کی بد حالی کا رونا روتے تھے۔ وہ بھی خوش دلی کے ساتھ راضی ہو گئے اور سب نے چپ چاپ اس سہولت کو پی لیا۔

کیا سیاسی نمائندے اور کیا مذہب کے ٹھیکیدار اپنے مفاد کے حصول کے لئے سارا عوامی غم بھلا بیٹھے۔ وہ تو بھلا ہو کچھ صحافیوں کا جنھوں نے اخبارات میں اس کیس کو اچھالا اور اس طرح ارکانِ اسمبلی کا حقیقی چہرہ سامنے آیا۔ مگر خیر، ہونا کیا تھا دو چار دن شور مچا پھر وہی خاموشی اور بے حسی۔ جس ملک کے سیاسی رہنماؤں کی ہیروئن کی فیکٹریاں اور مذہبی رہنماؤں کا آتشیں اسلحہ کا کاروبار ہو۔۔۔ آپ کیا سمجھتے ہیں وہاں سیاسی تربیت اور اسلامی تربیت کوئی امکان ہے۔۔۔ قطعاً نہیں۔

یہاں بھی کچھ مخلص اور شریف افراد کو استثنائی گروہ میں شامل کرنا پڑے گا مگر اس شیطانی نظام میں اُن سے کسی معجزے کی توقع فضول ہے۔

چوتھا عفریت :۔ اسلام سے نا آشنا اسلام کے ٹھیکیدار مُلّا :

جہاں تاریخِ اسلام وارثانِ انبیاء یعنی علمائے حق کی قربانیوں سے پُر ہے اور ان کے پاک خون سے منوّر ہے، وہیں ہر دور میں علماء کا لبادہ اوڑھ کر اسلام پر شب خون مارنے والے نام نہاد ملاؤں کا بھی بڑا ہاتھ ہے۔ جو کسی خاص مکتب کے نہیں بلکہ ہر مکتبِ فکر میں موجود رہے ہیں۔ اور اس تحریر میں میرا اشارہ انہیں دین فروشوں کی طرف ہے نہ کہ ان علمائے حق کی طرف کہ جو اسلام کی پیشانی کا جگمگاتا ہوا جھومر ہیں۔ اور جن کے قلم کی روشنائی شہداء کے

خون سے افضل ہے۔ لیکن ان دوسری قسم کے نام نہاد ملاؤں کے خلاف بھی بات کرنا، اِن کے خلاف قلم اُٹھانا، اِن کے مکروہ چہرے سے نقاب اُٹھانا، کاسۂ سر اپنے ہاتھ میں اُٹھانے کے مترادف ہے۔

اگر لوگوں کے سامنے ان کا حقیقی روپ پیش کرنے کے عوض سر دینا پڑتا ہے تو سودا مہنگا نہیں ہے۔ ان جعلی ملاؤں میں اور قرآنِ کریم میں پیش کئے جانے والے یہود و نصاریٰ کے احبار اور رہبانیوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ یہ بھی آیاتِ الٰہی کا سودا بڑے سستے داموں کرتے ہیں۔ دین کی طرف مڑنے کے بجائے دین کو اپنی جانب موڑتے ہیں یہ جس اسلام کے دعویدار ہیں اس میں سلامتی ہی نہیں ہے باقی سب کچھ ہے۔

یہ جو اسلام دنیا کے سامنے پیش کر رہے ہیں اِسکا پیغمبر ختمی مرتبتؐ کے اسلام سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ پیغمبر اکرمؐ نے اسلام پھیلایا یہ مسلک پھیلاتے ہیں، منجی بشریتؐ نے جاہل، متعصب اور وحشی لوگوں کو انسان بنایا اور یہ انسانوں کو واپس جہالت، تعصب اور وحشت و بربریت کے راستے پر لئے جا رہے ہیں۔ رسولؐ بدترین دشمنوں پر بھی قابو پانے کے بعد روزِ فتح مکہ شہر میں رحمت اور شفقت بن کر داخل ہوتا ہے۔ یہ جہاں جاتے ہیں خونریزی اور تاراجی کی داستانیں رقم کرتے ہیں۔ رسولِ عربیؐ نے مساجد کو فلاح کی دعوت دینے کے لئے تعمیر کرایا۔ یہ قتل و غارت گری کی دعوت کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ یہ اپنے مذہبی مقام کو معاشرے میں محبت کی شیرینی پھیلانے کے بجائے زہر پھیلانے کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ یہ وہ زہریلے انسان ہیں جن سے سانپ اور بچھو بھی پناہ مانگتے ہیں۔ لوگوں کو

تقویٰ و پرہیز گاری کا درس دینے والے یہ لوگ خود مادہ پرستی اور خواہشاتِ نفسانی کی پیروی میں سب لوگوں سے آگے ہیں۔

مساجد پر قبضے کا مسئلہ ہو یا مدارس کی آڑ میں زمین گھیرنے کا معاملہ یہ اُن جرائم پیشہ سیاستدانوں سے بھی چار ہاتھ آگے ہیں کیونکہ سیاست دان جو کچھ کرتے ہیں دین کی آڑ میں نہیں کرتے مگر یہ دین کے ٹھیکیدار وہی سارے کام دین کا لبادہ اوڑھ کر انجام دیتے ہیں۔اور عوام الناس کو علمائے باعمل سے بھی بد ظن کر دیتے ہیں۔

لوگوں کو خمس و زکواۃ کے معاملے میں خدا سے ڈرانے والے یہ لوگ کتنی آزادی سے خمس و زکواۃ ہڑپ کر جاتے ہیں۔وہ ان کے اور ان کی اولادوں کے طرزِ زندگی سے ظاہر ہے۔ سرمایہ داروں کے لئے مسند بچھاتے ہیں۔ جاگیرداروں کے خوشامدی اور چاپلوس، سیٹھوں کے سامنے سراپا التجاء، اور اگر کوئی ضرورت مند، مسکین، محتاج بھولے سے ان کے در پر چلا جائے تو پھر دیکھئے اُس غریب کی کتنی توہین ہوتی ہے۔

یہی مادّی خواہشات انھیں شیطانی طاقتوں کا آلہ کار بنا دیتی ہیں۔مدارس کی مالی امداد کی آڑ میں یہ قوتیں ان میں نفوذ پیدا کرتی ہیں اور یہ مال کی چکاچوند سے اندھے ہو کر اپنے دین و ضمیر دونوں کا سودا کر لیتے ہیں اور مال دینے والوں کے آلہ کار بن جاتے ہیں انسانی بستیوں کی بربادی کیلئے خوں آشام بھیڑیئے بن جاتے ہیں۔اور ایسے میں لوگوں کو تمیز کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ صحیح اور غلط علماء کو کیسے پہچانا جائے ؟۔

ہمارے مکتب میں تو خدا کا شکر ہے کہ صورتِ حال بہت بہتر ہے مگر دوسری

جگہوں پر تو یہ عالم ہے کہ افلاس زدہ، بھوک و غربت کے ستائے ہوئے ماں باپ اپنے جگر کے ٹکڑے ان کے حوالے کر دیتے ہیں کہ کم از کم بھوکا تو نہیں مرے گا۔ معاشرے کے ٹھکرائے ہوئے یہ بچے، خیرات اور صدقات کے مال پر پروان چڑھنے والے یہی معصوم بچے جب ہر جمعرات اپنے ٹھیکیدار مدرسے کے مالک ملاّ کے حکم پر محلّے کے گھر گھر جا کر کھانا مانگ رہے ہوتے ہیں تو اُس وقت سے اُن کے ذہن میں اس معاشرے سے انتقام لینے کا لاوا پکنا شروع ہو جاتا ہے۔ (یہ میں نہیں کہہ رہا بلکہ بین الاقوامی میڈیا نے بھی انکی یہی منظر کشی کی ہے)۔

احساسِ کمتری کے شکار یہ معصوم بچے یکایک وحشی درندوں میں تبدیل ہو جاتے ہیں، اور جن دروازوں پر انھیں ایک ایک وقت کی روٹی کے لئے جانا پڑتا تھا۔ اُن دروازوں میں جنازے رکھوا دیتے ہیں اُن گھروں میں صفِ ماتم بچھوا دیتے ہیں۔ (خدا کا شکر ہے کہ ہمارے مدارس کم از کم اس معاملے میں دوسرے مکاتب سے بہت اچھے ہیں)۔

یاد رہے کہ میں ہر مکتب کے اسلام نا آشنا ملاّؤں کی بات کر رہا ہوں۔ اُن علماء کی بات نہیں کر رہا جو دوسروں کا خون بہانے کے بجائے اپنے ہی خون جگر کو روشنائی بنا کر حقیقی اسلام کی تاریخ درج کرتے ہیں۔ ہر دور میں سامراج اور اُس کے گماشتوں کے لیئے چیلنج بن جاتے ہیں۔ نہ دین کا سودا کرتے ہیں نہ ضمیر کا۔ جنھوں نے جوانوں کو اپنے مقاصد کی بھینٹ چڑھانے کے بجائے خود سولی پر چڑھنا گوارا کر لیا۔

گذشتہ ایک صدی کا ہی مطالعہ کریں گے تو آپ کو جمال الدین افغانی سے لے کر

لبنان کے عباس موسوی تک مبارز علماء کی ایک طویل فہرست مل جائے گی جو اپنی صلیب اپنے کاندھوں پر اٹھائے اٹھائے آخری سانس تک سامراج کا مقابلہ کرتے رہے۔ لیکن اِن مجاہد علماء کو بھی ان کے مقاصد حاصل کرنے کے دوران اُن کے خواب کو شرمندۂ تعبیر ہونے سے روکنے میں جہاں سامراجی طاقتوں کا ہاتھ تھا وہیں اِن اسلام نا آشنا اور فرقہ پرست ملاؤں کا بھی ہاتھ تھا جو انگریزی سامراج کو بھی ظلِّ الٰہی قرار دینے سے نہیں چوکتے اور انھیں اولی الامر قرار دے کر اُن کی اطاعت کو واجب گردانتے تھے۔ تاریخ ہند کے مطالعے کے دوران آپ کو کچھ مکاتب کے علماء کے ایسے فتوے مل جائیں گے جن میں انہوں نے برطانوی سامراج کے خلاف قیام کو حرام قرار دیا تھا۔

اگر عارف حسینیؒ اور ان کے امثال علماء نے جامِ شہادت نوش کیا تو اس لئے کہ اسلام نا آشنا ملاؤں کی ایک بڑی تعداد نے اپنے عمل کے ذریعے استعمار اور اس کے آلہ کاروں کو یقین دلا دیا تھا کہ ہم عارف حسینیؒ کی میراث کو اس طرح لوٹیں گے کہ آئندہ طویل عرصے تک عارف حسینیوں کا راستہ بند ہو جائے گا۔

جوانوں کو یاد رکھنا چاہیئے کہ اُن کے لئے نمونہ عمل عارف حسینیؒ اور اُن کے جیسے علماء ہونا چاہئیں۔ انھیں فرقہ واریت پھیلانے والے کچھ دین فروش اور ضمیر فروش ملاؤں کی حرکتوں سے مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ دنیا پرستوں کا وہ ٹولہ ہے جو دین کے مقدس لباس کی آڑ میں اپنی خواہشاتِ نفسانی کی تکمیل کر رہا ہے اور اس فعل پر بہت خوش ہے کہ کس طرح لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونک رہا ہے۔ مقدس اور متبرّک ناموں پر

"سپاہ" اور "جیش" ترتیب دیئے جارہے ہیں تاکہ اسلام کے نام پر ہی مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلی جائے۔

❀ ❀ ❀

آغازِ کار

گذشتہ صفحات میں اُن چار عفریتوں کا مختصر تعارف کرایا گیا جو تاریخی طور پر تو قدیم ہیں مگر سامرج نے انھیں جدید خطوط پر منظّم کر کے ہمارے معاشرے پر اس طرح مسلط کر دیا ہے جیسے آکٹوپس (ہشت پا) سمندر کی کمزور مخلوق کو جکڑ کر بے بس کر دیتا ہے۔

انسانیت کے یہ دشمن اِس سے کہیں زیادہ خطرناک، زہریلے، خوں آشام اور مضبوط ہیں جتنا گذشتہ سطور میں بیان کیا گیا ہے۔ پس اِن سے مقابلہ کے لئے بھی ایک طویل اور منظّم جدوجہد کی ضرورت ہے۔

اس موقع پر یہ یاد دہانی ضروری ہے کہ ظلم کی جڑیں کاٹنے کے لئے کبھی بھی ظلم کا ہتھیار استعمال نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اس کا نتیجہ ایک ظلم کے بعد دوسرے ظلم کے دور کا آغاز ہو گا بلکہ ظلم کو مٹانے کے لئے مظلومیت ہی کے ہتھیار کو استعمال کرنا پڑے گا اور یہ بات طے ہے کہ ظالم کے ہاتھوں ظلم کی چکی میں پسنے والے افراد کی تعداد کہیں زیادہ بلکہ بہت زیادہ

ہے۔دوسری بات یہ کہ ظالم بنیادی طور پر بزدل واقع ہوتا ہے۔

ہمارا پہلا کام یہ ہونا چاہیئے کہ سادہ اور جہالت کے شکار لوگوں میں علم و آگہی پیدا کریں یعنی پہلا مرحلہ جہاد باللسان اور جہاد بالقلم ہے۔ یقیناً ہمارے معاشرے میں ایسا با ضمیر دانشور طبقہ وجود رکھتا ہے جس کے دل میں مذہب وملّت کی تڑپ موجود ہے اور جو مذہب وملّت کی زبوں حالی پر رنجیدہ بھی ہے اور کوئی حل بھی چاہتا ہے۔

ہمیں ایسے ہی با ضمیر علماء ، خطباء ،ادیب اور شعراء اور دیگر نمائندہ طبقات پر مشتمل ایک تربیت یافتہ گروہ تیار کرنا پڑے گا جو اچھی طرح اس بات کو سمجھ لے کہ ”زندگی ایک عقیدہ اور اُس کی خاطر جہاد کا نام ہے۔“ ابتداء میں یہ کام مشکل نظر آتا ہے لیکن جب ہم اپنے آگے صفر لگا ہی چکے ہیں تو پھر کوئی پروا نہیں۔ ہر قدم آگے ہی شمار ہو گا چاہے کتنی ہی سست رفتاری سے کیوں نہ بڑھ رہا ہو۔

یہ گروہ اپنی تحریر ،اپنے اشعار، اپنے زورِ بیان اور علمی صلاحیتوں کو صرف اور صرف مظلوم انسانوں کو ظالم دشمن کی شناخت کرانے اور انھیں یکجا کرنے پر صرف کر دیں۔ مظلوم لوگوں کا متحد ہونا خود ایک انقلاب کی علامت ہے۔ قوموں کے اجتماعی فیصلے ہمیشہ درست ہوتے ہیں۔ایسے مرحلوں میں طبیعت تشدد کی طرف مائل ہوتی ہے لیکن ہمیں اپنے جوانوں کو تشدد سے روکنا ہے۔ یہ جوان نسل اس لئے نہیں ہے کہ اِسے تشدد اور قتل و غارتگری کے راستے پر ڈال کر انسانیت کو مزید تباہی سے ہمکنار کرنے میں ہاتھ بٹایا جائے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ بوقت ضرورت دفاع کا حق دنیا کا ہر مذہب اور قانون ہمیں دیتا ہے۔

ہر وقت دھیان رہے کہ ہم نے حالات کو بہتر کرنے کا بیڑا اٹھایا ہے نہ کہ خراب تر کرنے کا۔ ہمیں عوام کی قطعی اکثریتِ کو انقلاب کے راستے پر ڈالنا ہے۔ جب عوامی سیلاب امڈ پڑے گا تو وہ ایک فطری مبارزے کی طرف بڑھے گا اور وہ عوامی ریلا اصل دشمنوں کو غرق کرے گا۔ ہمارا رستہ انبیاء کا راستہ ہونا چاہیئے۔ ہماری تحریک پوری طرح رسول اکرمؐ کی تحریک میں ڈوبی ہوئی ہونی چاہیئے جہاں دفاعی حکمت عملی بھی اس طرح کی جاتی ہے جسمیں ظلم و تعدّی کا ذرا بھی امکان نہ رہ جائے۔ اس کے لئے بڑے ہی حوصلے، شجاعت اور صبر کی ضرورت ہے آئمہ طاہرین کی زندگی اور سیرت سے مکمل آگہی ہی ہمیں یہ بصیرت عطا کر سکتی ہے۔

ایسے افراد کا راسخ العقیدہ ہونا اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ مچھلی کی حیات کے لئے پانی۔ خدا پر ایمان، اُسکی وحدانیت اور کبریائی پر یقین کامل، اسکے نظام عدل پر اطمینان و اعتبار، پیغمبر ختمی مرتبتؐ اور انبیاءِ ماسلف کی تصدیق اور دل میں اُنکی محبت، آئمہ طاہرین کا عشق اور انھیں کے راستے پر گامزن رہنے کا عزم، روزِ جزا پر ایسا یقین گویا جنت اور جہنم کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر رہا ہو۔

یہ سب زبانی کلامی جمع خرچ نہ ہو بلکہ اسکا ایک ایک عمل اسکے عقیدے کی پختگی کی گواہی دے۔ ایسے افراد سے پروردگار کا وعدہ ہے کہ " اِن تَنْصُرُ اللّٰہَ یَنْصُر کُمْ وَیُثَبِّتْ اَقْدَا مَکُمْ " تم خدا کے دین کی نصرت کرو خدا تمھاری مدد کرے گا۔ اور تمھیں ثابت قدم رکھے گا۔ جب ہم انبیاء اور آئمہ طاہرین کے راستے پر گامزن ہونے کی بات کر رہے ہیں تو

پھر ہمیں اپنی فکر کا دائرہ بھی بڑھانا ہوگا آفاقی فکر پیدا کرنی ہوگی۔ ہمیں فرقہ اور مکتب سے بالا تر ہو کر اسلامِ محمدیؐ کی تصویر اجاگر کرنا ہوگی۔

نجات اور رہائی کسی ایک گروہ کی نہیں بلکہ بلکتی اور سسکتی انسانیت کے ہر گروہ ہر مکتب کی۔ کیونکہ ہر مسلک میں ظلم کے مارے اور مصیبت زدہ انسان موجود ہیں۔ مسلکِ انبیاء اور آئمہ یہ ہے کہ خدا کی مخلوق کی بات کرو۔ تمام انسانوں کی بات کرو۔ یہی اسلام ہے، یہی دین ہے، یہی وہ راستہ ہے جو دشوار گذار اور پر خطر ہے۔ لیکن ہمیں اسپر قدم رکھنا ہوگا۔

خوف اور دہشت کے ماحول میں زندگی بسر کرنے والے یہ انسان کسی نجات دہندہ کا راستہ دیکھ رہے ہیں۔ سیاسی اور مذہبی لبادے میں چھپے ہوئے بھیڑیوں کے ڈنک خوردہ یہ لوگ اپنے زخموں کے مرہم کی تلاش میں ہیں۔ یہ کمزور اور ضعیف انسان سوائے انتظار کے اور کیا کر سکتے ہیں۔ ان میں تو اتنی قوت اور سکت بھی نہیں کہ یہ بھیڑیوں کے اس جنگل سے کہیں اور ہجرت کر جائیں۔

ہم بھی انتظار کر رہے ہیں اُسکا جسکا وعدہ خدا نے کیا ہے جسکی بشارت رسولِ اکرمؐ نے دی ہے۔ مگر کیا صرف ہاتھ پہ ہاتھ دھرے انتظار کرتے رہیں یا اُس آنے والے کی لیئے زمین ہموار کریں۔ اندھیری رات میں اِدھر اُدھر ٹھوکریں کھاتے رہیں یا دیے پر دیے جلاتے رہیں۔ یقیناً اُن لوگوں پر دیے جلانا واجب ہے جو فلسفہ انتظار سے آشنا ہیں اور خدا نے انھیں سوچنے سمجھنے کی صلاحیتوں سے مالامال کیا ہے۔

عام حالات میں بلند و بانگ دعوے سبھی کرتے ہیں۔ لیکن ان دعوؤں کی حقیقت

اسوقت عیاں ہوتی ہے جب مشکل حالات درپیش ہوتے ہیں۔ بقولِ شہید مصطفےٰ چمران کے " جب نقارہ جنگ پر چوٹ پڑتی ہے تو بہادر و بزدل میں تمیز و تشخیص ہو جاتی ہے"۔ میدانِ امتحان میں معلوم ہوتا ہے کہ کون اپنے قول میں سچا ہے اور کون صرف شیخیاں بھگارنے والا۔ انسان کی صلاحیتوں کا امتحان بحرانی حالات میں ہوتا ہے۔ جو بحران کے دوران اپنے اعصاب پر قابو رکھے، حواس کو اپنے کنٹرول میں رکھے اور مردانہ وار میدانِ عمل میں اُتر آئے انہی لوگوں کے لئے کلامِ الٰہی میں ارشاد ہو رہا ہے کہ۔

مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَاعَاهَدُ واللّٰهَ عَلَيْهِ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلاً.

سورہ احزاب۔ ۲۳

ترجمہ :۔ مومنین میں کچھ مرد ایسے ہیں جو خدا سے کئے ہوئے اپنے عہد کو پورا کر دکھاتے ہیں ان میں سے کچھ (یہ عہد پورا کر کے) جا چکے اور کچھ اپنی باری کا انتظار کر رہے ہیں اور اس (طریقے) میں کوئی تبدیل آنے والی نہیں۔

آج ایسے ہی حالات کا سامنا ہے کہ مردانِ خدا کو اپنا عہد پور کرنا ہے۔ تاریخ رقم

کرنا ہے اور وقت کے دھارے کو موڑنا ہے، بکھری ہوئی قوت کو یکجا کرنا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ افراد کی قلّت ہے۔ بلکہ ایک ایسے مرکز کی ضرورت ہے جہاں اس منتشر قوت کو جمع کیا جاسکے۔

زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جہاں باایمان اور اہلِ فکرو نظر افراد نہ ہوں۔ یہ سب اپنی اپنی جگہ پریشان ہیں کہ کیا کیا جائے اور کیسے کیا جائے اور پھر جب اُن کی نظریں علماء کی طرف اٹھتی ہیں۔ کیونکہ یہی وہ صنف ہے جو قوم کو منجدھار سے نکال سکتی ہے۔ لیکن کم از کم موجودہ صورتحال یہ ہے کہ دوسروں سے بہتر ہونے کے باوجود ان میں بھی ایسے افراد کی کمی ہے جو عصری تقاضوں اور جدید مسائل سے فکری طور پر مکمل ہم آہنگی رکھتے ہوں۔ بہت ہی معذرت کے ساتھ دیکھنے میں آیا ہے کہ بعض جگہوں پر تو بعض افراد دین کی بنیادی ضرورتوں سے بھی ناآشنا ہیں۔ ان کے پاس ملّت کو دینے کے لیئے کچھ بھی نہیں ہے بلکہ یہ تو ملّت کے پاس جو کچھ ہے اُسے بھی سمیٹنے کی فکر میں لگے ہوئے ہیں۔

یقیناً چند مخلص اور دردِ دل رکھنے والے علماء ضرور ہیں جو اپنے تئیں زخموں پر مرہم رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان میں قلیل تعداد ایسے علماء کی بھی ہے جنکی مسائل پر پوری طرح نظر ہے۔ وہ سازشوں کو دیکھ بھی رہے ہیں اور سمجھ بھی رہے ہیں مگر اُن کی آواز میں اتنی قوت نہیں ہے کہ ملّت اُن کے پیچھے چلے۔ دراصل تقدس کے لبادے میں علماء کے مقام کو کچھ دنیادار ملاؤں نے اس طرح تباہ کیا ہے اور علماء کے اعتبار کو اس بری طرح ٹھیس پہنچائی ہے کہ اب لوگوں کی نظر میں ہر عالم مشکوک ہو گیا ہے۔ اور وہ اس میں حق بجانب بھی

ہیں کیونکہ ان کے پاس حقیقی اور گندم نما جو فروش علمائے سوء کو پرکھنے کی میزان نہیں ہے۔

جب قیادت اور رہبری بازاری پن پر اُتر آئے اور اپنی حرکات سے ملّت کا اعتماد کھو بیٹھے تو پھر فطری ردِ عمل یہ ہوتا ہے کہ گلی گلی قیادتیں بننے لگتی ہیں اور وہ منصب جو قوم کے عزت و وقار کی علامت ہوتا ہے شرمندگی کا باعث بن جاتا ہے۔ اور یہ افسوسناک صورتِ حال صرف ہمارے ہاں ہی نہیں بلکہ ہم سے زیادہ دوسرے مکاتبِ فکر میں موجود ہے۔ لیکن یہ بات ہمارے اطمینان کے لئے کافی نہیں، بلکہ ہمیں تو پہلے مرحلے میں خود اپنے حالات کی بہتری کی طرف قدم بڑھانا ہے۔

ایسے حالات میں ضروری نہیں اور نہ ہی واجب ہے کہ اسی لباس کو قیادت کے لئے تلاش کیا جائے بلکہ راہِ حل یوں بھی ڈھونڈی جا سکتی ہے کہ ملّت و مذہب کے مخلص اور اہل نظر افراد چاہے وہ زندگی کے کسی بھی شعبے سے ہوں مگر اہلیت رکھتے ہوں ان پر مشتمل ایک گروہ آگے بڑھے۔ ان میں ایک شعبہ علماء کا بھی ہو۔ یہ بہت ضروری ہے کیونکہ جب ہم دیکھ رہے ہیں کہ ایک کثیر تعداد لوگوں کی اپنے آپکو بالکل علیحدہ کئے ہوئے ہے اور ملت کے مسائل سے علیحدگی اختیار کرنے والوں کی اکثریت دانشوروں کی ہے تو ہمیں بھی ان کا اعتماد حال کرنا ہوگا۔ اور ساری قوم کو قومی دھارے میں شامل کرنا ہوگا۔

اور ویسے بھی قیادت بنائی نہیں جاتی بلکہ یہ خود اُبھر کر سامنے آتی ہے۔ جب ہم سب ملکر آگے بڑھیں گے تو خدا ہماری مدد کرے گا۔ ہماری قوم ابھی بانجھ نہیں ہوئی ہے بلکہ ہمیں حالات کو سازگار کرنے کی ضرورت ہے جونہی ہم ایک صحیح ڈگر پر چل پڑیں گے قدرتی

طور پر قیادت ابھرے گی ہمیں کیا معلوم کہ ہمارے گلی کوچوں میں اور ماؤں کی گودوں میں کیسے کیسے لعل و گوہر پل رہے ہیں۔ کچھ وقت بڑی ہمت اور صبر کے ساتھ ایک کٹھن اور مشکل سفر طے کرنا پڑے گا۔ بالآخر ہم اپنے گوہر مقصود کو پالیں گے۔

پہلے طالوت کا لشکر ترتیب دینے کی ضرورت ہے۔ پھر اس لشکر میں کوئی نہ کوئی داؤد نکل ہی آئے گا جو جالود کو سرنگوں کر دے گا۔

ذمہ داریاں!

طلباء کی ذمہ داریاں :۔ بد قسمتی سے اب طالب علم دو(2) قسموں پر تقسیم ہو چکے ہیں ایک دینی طالبِ علم اور ایک دنیاوی طالبِ علم۔لہذا ہمیں بھی فی الحال دونوں کو الگ الگ ذمہ داریاں دینا پریں گی۔اسوقت تک جبتک یہ دونوں پھر سے ایک نہیں ہو جاتے۔ مطلب یہ ہے کہ صحیح معنی میں تعلیمی نظام ہی ایسا ہونا چاہیئے کہ الگ الگ دینی دمدارس اور دنیاوی تعلیمی اسکولوں کے بجائے ایک ہی دانش کدہ میں سارے علوم پڑھائے جائیں پھر آگے چل کر جسکی جیسی صلاحیت ہواُسے اسی میدان میں تخصص (Specialization) کرایا جائے۔ تاکہ وہ جس میدان میں بھی جائے ایمان کی دولت سے مالامال جائے۔

دینی طلباء کی ذمہ داریاں :۔ کوئی بھی جوان دینی مدرسے میں داخلہ لینے سے

پہلے ہزار بار سوچے کہ وہ کس وادی میں قدم رکھ رہا ہے اُسے پیشہ ور اور روایتی مولوی بنتا ہے یا واقعی دین کی نظریاتی سرحدوں کا نگہبان۔ خود اُسکی مرضی ہے کہ وہ عالم دین بنے یا حالات کا جبر اسے دینی مدرسے تک کھینچ لایا ہے۔ مثلاً معاشی مجبوریاں یا کند ذہنی کے سبب ماں باپ اسے زبردستی مدرسے میں بٹھانا چاہتے ہیں یا بے چارہ باپ کثیر العیالی اور قلیل آمدنی کے باعث اسے مدرسے کے سر تھونپنا چاہتا ہے۔

بلکہ بعض دفعہ اور بعض جگہ تو یہ بھی مشاہدے میں آیا ہے کہ دینی مدرسہ فقط ایک ہاسٹل کی شکل اختیار کر جاتا ہے دوسرے علاقوں سے آنے والے ہوشیار لڑکے کالجوں میں داخلے لیکر مفت رہائش اور خوراک کی سہولت اس مدرسے سے حاصل کر لیتے ہیں۔ کالج سے فارغ ہوتے ہی مدرسے سے بھی فارغ ہو جاتے ہیں یا اسوقت تک اپنے قیام کو طول دیتے ہیں جب تک کہیں نوکری نہیں مل جاتی۔ (میری بات کا برا ماننے سے پہلے بعض ایسے مدارس کا دورہ کر کے میری بات کی تحقیق و تصدیق ضرور کر لیں)۔

مفت طعام و قیام کے علاوہ انھیں ماہانہ وظیفہ کی صورت میں آمد و رفت کا کرایہ بھی مل جاتا ہے۔ یہ تو ہے خیانت اور ایسا فرد سوائے اپنے نفس کو دھوکہ دینے کے اور کچھ بھی حاصل نہیں کر رہا ہے۔ ایسے افراد نہ دین کے خدمت گذار بن سکتے ہیں اور نہ ہی دین کی نظریاتی سرحدوں کے محافظ۔

ایک کند ذہن فرد کو جسے اسکے ماں باپ مدرسے کے سر تھونپ جاتے ہیں آپ اس سے کیا توقع کرتے ہیں جو دنیاوی تعلیم میں فیل ہو رہا وہ دین کے مسائل کا کیا حشر کرے گا۔

اسکی بے شمار مثالیں محلّے محلّے اور گلی گلی آپ کو بکھری ہوئی نظر آجائیں گی۔ ظاہر ہے جو آپ بوئیں گے وہی کاٹیں گے۔ جو آپ مدرسوں کے حوالے کریں گے وہی آپ کو واپس ملے گا۔ یہ بات اس زمانے پر ہی موقوف نہیں ہے۔ بلکہ ہر زمانے میں ایسا ہی ہوتا رہا ہے۔ اقبال نے ہمارے مدارس نہیں بلکہ اپنے ہی مکتب کے مدارس اور ان سے بننے والے مولویوں کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار اس طرح سے کیا تھا ۔

قوم کیا چیز ہے قوموں کی امامت کیا ہے
اسکو کیا سمجھیں یہ بے چارے دو رکعت کے امام

اس لئے ضروری ہے کہ اس وادی پُرخار میں قدم رکھنے سے پہلے ہزار بار فکر کرے سوچ لے پھر قدم اٹھائے، اپنے خدا سے عہد کرے، اپنے آپ سے عہد کرے۔ مدرسے میں جانے کے بعد اس کا ایک ایک لمحہ وقف دینِ خدا ہے اسکی سانسیں وقفِ دین ہیں۔ اس کی نیند اس کی بیداری اسکے افکار سب مذہب وملّت کے لیئے وقف ہوں۔ ایک لمحے کے لیئے بھی فراموش نہ کرے کہ وہ لشکر خدا کا سپاہی ہے اور لشکر خدا کے سپاہی کو کن صفات کا حامل ہونا چاہیئے ؟ طوالت سے بچنے کے لئے پھر فخرِ اقبالؔ کا سہارا لیتا ہوں۔

سبق پھر پڑھ صداقت کا عدالت کا شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

اقبالؔ پر بھی علماء دشمنی کا الزام اسی لئے لگا تھا کہ اس کے سامنے جو علماء تھے وہ انگریزوں کے کاسہ لیس تھے اور اقبالؔ اپنے علماء کو بوذر و سلمان کی طرح دیکھنا چاتا تھا۔

قوموں کی امامت و رہبری کوئی آسان مسئلہ نہیں ہے کہ جس نے اپنے جسم پر دستار و قبا سجالی وہ رہبری کا حقدار ہو گیا۔ بلکہ اسکا تعلق ان صفات سے ہے جو انسان اپنے اندر پیدا کر لیتا ہے بلکہ انسان بھی ان صلاحیتوں کو پیدا نہیں کر سکتا۔ وہ تو صرف اپنے اندر اہلیت پیدا کرتا ہے۔ جب اپنے اندر اہلیت و لیاقت پیدا کر لیتا ہے تو پروردگار خود ہی یہ صلاحیت اور منصب اپنے بندے کو عطا کر دیتا ہے۔

عزیز دینی طالبِ علمو! ہمارے مدارس کا ماحول اور معیار دوسروں سے کہیں بہتر ہے مگر بعض مرتبہ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ بعض انتہائی پاک اور مخلص اور دین کی خدمت کے جذبے سے سرشار جوان دینی مدارس میں داخلہ لیتے ہیں۔ لیکن بعض مدارس کے ماحول سے مایوس ہو کر یا تو دینی تعلیم ہی ترک کر دیتے ہیں یا اُسی ماحول میں رنگ جاتے ہیں اور انکا وجود زہر آلود ہو جاتا ہے۔

یقیناً جب آپ مدرسے میں داخل ہوتے ہیں اور درس و تدریس کا آغاز ہوتا ہے تو آپکو سب سے پہلے ان احادیث کو بھی یاد کرایا جاتا ہے اور ذہن نشین کرایا جاتا ہے جس میں طالب علم کی فضیلت اور اسکے مقام کو بیان کیا گیا ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ جب کوئی گھر سے تحصیل علم کے لیئے نکلتا ہے تو ملائکہ اسکے قدموں تلے اپنے پر بچھا دیتے ہیں۔ لیکن یہی طالب علم جب مقصد سے ہٹ کر صرف دنیا کے حصول میں مبتلا ہو جاتا ہے تو پھر ملائکہ

نہیں بلکہ شیطان اپنی آنکھیں اس کے لئے فرشِ راہ کر دیتا ہے اور اسی دین کے مبلغ سے دین کی تخریب کا کام لیتا ہے۔ خدا ہمارے دینی طالبِ علموں کو شیطانِ مردود سے اپنی پناہ میں رکھے۔

تو اب دینی مدرسے میں رہتے ہوئے ہر وقت اپنی چوکیداری بھی کرنا ہے۔ دوسرے کیا کر رہے ہیں اس سے کوئی غرض نہیں ہونا چاہیئے۔ ہر دور میں یہی کچھ ہوتا رہا ہے سیکڑوں بلکہ ہزاروں انسان عالم بننے جاتے ہیں مگر اُن ہزاروں میں سب کے سب خمینی، بہشتی، مطہری، حسینی نہیں بن جاتے بلکہ ہزاروں میں کوئی ایک ایسا نکلتا ہے جو معاشرے میں انقلاب برپا کرنے کی صلاحیت حاصل کر لیتا ہے۔

جسطرح ایک صدف حاصل کرنے کے لئے برسوں غوطہ خور بے شمار سیپیاں نکالتا ہے اسی طرح ہزاروں طلبہ میں کوئی ایک امام کی نیابت کا حقدار بنتا ہے۔

معاشرے کی اصلاح کے لیئے ضروری ہے کہ پہلے خود اصلاح کے مرکز اور سر چشمہ کی اصلاح کی جائے۔ علم صرف کتابیں پڑھ لینے کا نام نہیں ہے۔ علم تو ایک نور ہے ایک روشنی ہے ایک آگہی ہے، شعور کی معراج ہے، علم تو آفاق کی وسعتوں میں گم ہو جانے کا نام ہے۔ مدرسہ، کتاب، استاد یہ سب اُسی گوہرِ نایاب کو حاصل کرنے کے وسائل ہیں۔ جب میں دینی مراکز کی اصلاح کی بات کر رہا ہوں تو میری مراد اُن مدارس سے نہیں ہے جو پاک اور باصفا علماء کے زیرِ نگرانی ایمانی اور روحانی ماحول میں چل رہے ہیں بلکہ میری مراد وہ ادارے ہیں جہاں انتظامی صلاحیتوں سے محروم افراد ان مدارس اور اداروں کے سرپرست بنے بیٹھے ہیں۔

❀ ❀ ❀

دینی مدارس کی اصلاح!

اُن باایمان اور ذمہ دار اساتذہ سے انتہائی معذرت کے ساتھ کہ جو دیانتداری اور دردمند دل کے ساتھ مستقبل کے علماء کی تیاریوں میں مصروف ہیں لیکن یہ باایمان اور باصفا اساتذہ بھی میری اس بات کی تائید کریں گے کہ زندگی کے ہر شعبے کی طرح اس مقدس شعبے میں بھی پروفیشنلزم (کاروباری انداز) گھس آیا ہے۔

بعض مدارس کا یہ حال ہے کہ یہ کچھ لوگوں کی دکان ہیں جہاں قوم و مذہب کی خدمت سے زیادہ اپنے اور اپنے آنے والے بچوں کے لئے ٹھکانہ بنانا مقصود نظر آتا ہے۔ یہ کتنے افسوس کی بات ہے کہ مسجد اور مدرسہ کہ اپنی میراث سمجھ لیا جاتا ہے۔ پیش امام چاہتا ہے کہ میری اولاد قابل ہو یا نہ ہو مسجد کی امامت میرے پاس یا میرے بچوں کے پاس ہی رہنی چاہیئے۔ ہمارے بعض بہترین دینی مراکز صرف اس لئے غیر معیاری ہو گئے کہ بزرگ علماء کے جانے کے بعد وہاں نااہل افراد قابض ہو گئے۔

سب سے پہلے مدارس کو ذاتی ملکیت کی قید سے باہر نکالا جائے۔ وہ کیسے ہوگا؟

دراصل سارا جھگڑا اُن مفادات کا ہے جو مدرسے کے ذریعے حاصل کئے جاتے ہیں۔ ہم سب جانتے ہیں کہ خمس ہمارے اداروں کی بقاء اور ترقی کے لئے ریڑھ کی ہڈی کا کام دیتا ہے۔ لیکن اگر خدانخواستہ اسی خمس کا غلط استعمال ہونے لگے تو نہ صرف یہ کہ ادارے تباہ ہو جاتے ہیں بلکہ غرباء و فقراء بھی بے سرپرست ہو جاتے ہیں۔ ذرا غور کیجئے کہ اُس ابتلاء اور مذہب سے دوری کے دور میں بھی اربوں کے حساب سے خمس نکالا جاتا ہے۔ خمس پر چند مولویوں اور چند سرمایہ داروں کا قبضہ ہے۔ مال امام مدارس کی اور اجازہ رکھنے والے مولویوں کی نذر ہو جاتا ہے۔ اور سہم سادات کے مستحق سادات کی ایک فیصد تعداد کو بمشکل اُن کا حق پہنچ پاتا ہے۔ خمس لیتے وقت تو ساری زندگی کا حساب آپ سے لے لیا جاتا ہے۔ آج تک ہمارے ملک میں کسی نے وصول کئے جانے والے خمس کا بھی حساب دیا؟ یہ تو ہر شخص کو کہتے سنا ہے کہ ہمارے پاس فلاں فلاں مراجع عظام کی طرف سے خمس لینے کی اجازت ہے لیکن یہ آواز کہیں سے نہیں آتی کہ مستحق افراد خمس کے لئے ہم سے رجوع کریں۔

کیوں؟ کیا صرف ایک عام مومن امامؑ کا جواب دہ ہے علماء نہیں؟ یقیناً علماء کی جواب دہی سب سے زیادہ ہے۔ کاغذ کا ایک پرزہ جسے اجازے کا نام دیا گیا ہے اسپر بھی مرجع تقلید یہی لکھتا ہے کہ انتہائی احتیاط سے مربوط امور میں خرچ کرنے کے بعد اپنی معاشی ضرورت کو بھی صاحبِ اجازہ پورا کر سکتا ہے۔ بس اس ایک آخری جملے نے مصیبت کر دی۔ اب ایک مولوی کی معاشی ضرورت کیا ہے اس کی کوئی حدبندی نہیں ہے یا تو اس کا کوئی نہ کوئی

کروڑوں روپے کا پروجیکٹ ہوتا ہے اور پھر اُس پر جیکٹ کے بعد اُسکی عیال کی معاشی ضروریات۔ تو پھر اب ظاہر ہے کہ غریب آدمی کہاں جائے اس کی ضرورت کون پوری کرے ؟دوسری طرف کچھ علماء اور ذمہ دار مخیّر حضرات غرباء اور فقراء کی سرپرستی اور امداد کرتے ہیں تو سارا بوجھ بشمول الزامات اور تہمتوں کے ان کے سر پر آپڑتا ہے۔اگر اس خمس کے آنے اور جانے دونوں کا حساب ہونے لگے تو یقیناً قوم تیزی سے ترقی کی راہ پر گامزن ہو جائے گی۔

لہٰذا اس خمس کو مرکزیت (Centralize) حاصل ہونا چاہیئے لینے کا بھی اور دینے کا بھی حساب ہونا چاہیئے۔ ضرورت کے مطابق مدرسوں کا قیام۔ یہ نہیں کہ جہاں دل چاہے جسکا دل چاہے خمس کی دکان سجا کر اور خمس کا مال سمیٹ کر مدرسہ کھول کر بیٹھ جائے۔ علماء کے وظائف ان کی ضروریات کے مطابق۔ تحقیقی مراکز کا قیام جہاں علماء مختلف میدانوں اور موضوعات پر تحقیقاتی خدمات انجام دے سکیں۔ جدید علوم بالخصوص کمپیوٹر سائنس کے مراکز کا قیام، میڈیکل اور انجیئر نگ کالجز اور یونیورسٹیز کا قیام، ہسپتالوں کا قیام، بیواؤں، یتیموں اور نادار انسانوں کی سرپرستی، قوم کے بچوں کو لازمی طور پر تعلیمی زیور سے آراستہ کرانا، اسیروں کی دیکھ بھال کون سا مسئلہ ایسا ہے جو ہم خمس کے ذریعے حل نہیں کر سکتے مگر اسکا صحیح استعمال تو ہو۔ میں اس فکر میں تنہا نہیں ہوں۔ بلکہ بعض بزرگ علماء بھی میری اس فکر کی تائید کرتے ہیں۔

بظاہر میری یہ بات نئی اور عجیب لگے گی مگر مجھے یقین ہے کہ آنے والے وقت میں

یہ ساری قوم کی آواز ہوگی۔ جس طرح خمس نکلوانے کے لئے لوگوں کو تبلیغ اور ترغیب دی جاتی ہے بالکل اسی طرح خمس وصول کرنے والوں کو بھی پابند کرنا پڑے گا کہ وہ خود ہی سالانہ وصول کئے گئے خمس کا حساب شائع کریں۔ یہی خمس کی غیر منصفانہ تقسیم اداروں اور افراد میں رسّہ کشی کا باعث ہی نہیں بن رہی بلکہ درباری ملاؤں کی پیداوار میں مسلسل اضافے کا باعث بھی بن رہی ہے۔ کیونکہ یہی مال وزر علماء کو سرمایہ داروں کے در کا گدا بنا دیتا ہے۔ اور عوام کو علماء کے در کا۔ (عوام کو علماء کے در کا گدا ضرور ہونا چاہیئے مگر اس انداز سے نہیں جو مال حاصل کرنے کے لئے اپنایا جاتا ہے)۔

اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے دینی مدارس دین کے سچے اور مخلص محافظوں کی پرورش کریں تو ہمیں مدارس کے نظام میں بھی کچھ تبدیلی کرنا ہوگی۔ تمام مدارس میں ایک درسی نظام قائم کرنا ہوگا۔ مدرسے میں داخلہ لینے والے طلباء کا ایک معیار قائم کرنا ہوگا۔ علاقائی ضرورت کے مطابق مدارس قائم کرنے ہونگیں۔ اس مدرسہ کا کوئی مالک نہیں بلکہ منتظم اعلیٰ ہوگا جسکی مدت مقرر ہونا چاہیئے۔ اور یہ منتظم کا منصب ورثہ میں نہیں بلکہ اہلیت کی بنیاد پر ملنا چاہیئے۔ اور اس اہلیت کا فیصلہ علماء کا ایک بورڈ کرے۔ تمام شہروں میں مدارس کے قیام کے بعد کسی ایک شہر میں ایک "علمی شہر" جسے یونیورسٹی کہیے یا حوزہ علمیہ کہیے دینی طلاب کی اعلیٰ تعلیم یعنی اجتہاد کے لئے ہونا چاہیئے۔

ضروری نہیں کہ سارے طلاب دوسرے ممالک میں پڑھنے کے لئے جائیں۔ اور نہ ہی آج کے دور میں یہ ممکن ہے کہ یہاں کے سارے طلاب کو دوسری جگہوں پر داخلے مل

جائیں۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ کچھ عرصے کے لئے دوسرے ممالک سے قابل اساتذہ کو بلایا جائے آخر نصف صدی پہلے تک برّ صغیر میں اجتہاد ہوتا تھا یا نہیں۔ لیکن جب ہمارے مدارس کی سوچ ہی محدود ہو ان میں خود ہی آگے بڑھنے کا جذبہ نہ ہو اور استاد اس بات سے ڈرتا ہو کہ شاگرد کہیں مجھ سے آگے نہ نکل جائے۔ تو پھر ایسے مدارس سے توقعات فضول ہیں۔ وہ معاشرے کو مسائل کے بوجھ سے تو کیا آزاد کرائیں گے بلکہ خود معاشرے پر بوجھ بن جاتے ہیں۔

❀ ❀ ❀

کالجز کے طلباء کی ذمہ داریاں!

عزیز دوستو! آپکو ہم سے شکایتیں ہیں۔ آپ ہم سے بد گمان ہیں۔ اور بعید نہیں کہ آپکی ایک بڑی تعداد ہم سے مایوس بھی ہو چکی ہو۔ خیر میں ان سطور میں آپکے سامنے اپنی صنف کی صفائی پیش نہیں کرونگا۔ لیکن جو معروضات پیش کرنے جارہا ہوں شاید وہ آپکے غموں کا کچھ مداوا کر سکیں۔

یاد رکھیئے! حضرت آدمؑ سے لیکر آج تک کوئی دور کوئی زمانہ کوئی سر زمین ایسی نہیں کہ جہاں ایک ہی وقت میں اچھے اور برے لوگ نہ ہوں یہ دونوں قوتیں ہمیشہ بر سر پیکار رہی ہیں۔ بُرے لوگ صرف بُرے لوگ ہوتے ہیں۔ ان کی کوئی صنف نہیں ہوتی۔ بلکہ وہ انہی برائیوں اور خامیوں کو چھپانے کے لئے مختلف بھیس بدلتے رہتے ہیں۔ مثال کے طور پر آپکے سامنے ایک واقعہ نقل کرنا چاہتا ہوں جو میں نے دوران قیام قم میں ایک درس کے دوران اپنے کسی استاد سے سنا تھا۔ کہ آیت اللہ بروجردی کی مرجعیت کے دور میں کسی دینی مدرسے

میں طلباء کے کمروں میں چوریاں شروع ہو گئیں۔ طلباء شکایت لیکر آیت اللہ بروجردی کے پاس پہنچے اور عرض کیا کہ کچھ طالب علموں نے چوری شروع کر دی ہے۔ فوراً ہی آقائے بروجردی نے ٹوکا کہ خبردار پھر کسی طالب علم کو چور مت کہنا کیسے ہو سکتا ہے کہ کوئی دینی طالب علم چوری جیسا گناہ انجام دے بلکہ یوں کہو کہ کوئی چور طالب علم کے بھیس میں آیا ہے۔

تو عزیز جوانو! میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ میں آپکے سامنے صفائی پیش کرنا نہیں چاہتا بلکہ صرف اتنا ہی عرض کرنا چاہتا ہوں کہ بُرے کو ضرور بُرا کہیں مگر ساری صنف علماء کو بُرا بھلا مت کہیں۔ بالکل اس طرح جیسے کہ آپکی کلاس میں پڑھنے والے تمام اسٹوڈنٹس نہ تو ایک صلاحیت کے مالک ہوتے ہیں نہ ہی ایک جیسے نمبر حاصل کرتے ہیں اور نہ ہی سب کے سب پاس ہو جاتے ہیں۔ بس یہ ہم اور آپ ہی میں سے تو لوگ ہیں جو اِسی انسانی فطرت کے ساتھ مدارس میں جاتے ہیں کچھ تبدیل ہو جاتے ہیں کچھ ویسے کے ویسے صرف لباسِ علماء زیبِ تن کر کے واپس آجاتے ہیں۔

کیا پیغمبر اکرمؐ کے مبارک ترین دور میں تمام اصحاب یکساں رتبے کے حامل تھے؟ کیا جنگِ احد اور جنگِ حنین میں رسولِ اکرمؐ کو چھوڑ کر فرار اختیار کرنے والے صحابی نہ تھے؟ کیا آئمہ طاہرین کے شاگردوں میں انھیں کے خلاف بغاوت کرنے والے نہ تھے؟ کیا امام جعفر صادقؑ کے مدرسے سے متبرک اور مقدس مدرسہ کوئی ہو سکتا تھا؟ مگر کیا اُسی مدرسے کے تمام شاگرد امام کے معیار پر پورے اُتر سکے؟ یقیناً ایسا نہیں ہوا بلکہ ہر دور میں انبیاء اور

آئمہ کی تعلیمات بھی تمام لوگوں میں تبدیلی نہ لا سکی تو پھر ہم آج کے دور میں یہ توقع کیسے کرلیں کہ تمام علماء، دین کی ذمہ داریوں کو کماحقہ پورا کر سکیں گے۔ لیکن ایسا بھی کسی دور میں نہیں ہوا کہ زمانہ یکسر علمائے ربانی اور علمائے باعمل سے خالی ہو جائے۔ ہر دور میں مفاد پرست اور دین فروش ملائیت کے مقابلے میں مجاہد علماء کا مختصر ہی سہی ایک گروہ موجود رہا جو حق کے متلاشیوں کے لئے ظلم و جہل کی تپتی دھوپ میں شجر سایہ دار بنا رہا۔ اگر علمائے حق کی قربانیاں نہ ہوتیں تو اب تک تشیّع دم توڑ چکا ہوتا۔

بس پیچھے مڑ کر ہمیں تاریخ سے سبق ضرور لینا ہے۔ مگر قدم آگے ہی بڑھانا ہے۔

آپ یہ گمان بھی مت کیجئے کہ آپ دینی طالبِ علم نہیں ہیں۔ آپ کسی بھی اسکول، کالج یا یونیورسٹی میں کیوں نہ ہوں اگر آپ کے دل میں مذہب و ملّت کا درد موجود ہے، دین کی خدمت کا جذبہ رکھتے ہیں، جدوجہد کرنے کا حوصلہ رکھتے ہیں، طاغوت کی نفرت دل میں رکھتے ہیں، مظلوموں کے غم کو محسوس کر رہے ہیں تو آپ دین ہی کے طالبِ علم ہیں۔

آپ پڑھئے اور خوب پڑھئے آپ کی اپنے شعبوں میں مہارت اور ترقی دراصل مذہب و ملّت ہی کی ترقی ہے۔ سیاسی اور مذہبی بھیڑیوں کے مفادات کی بھینٹ چڑھنے سے اپنے آپ کو بچائیے نااہل لوگوں کو بلندی تک پہنچانے والی سیڑھیاں مت بنئے۔ آپ پر بہت ہی بھاری ذمہ داری ہے۔

درست ہے کہ جوانوں کے جذبات، احساسات اور فوری رد عمل کی خواہش دوسرے تمام طبقات سے زیادہ ہوتی ہے۔ وہ حالات کا درک کرتے ہیں تو فوری ردِ عمل بھی

چاہتے ہیں۔اور بعض دفعہ بلکہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جوانوں کے انھیں جذبات اور احساسات سے کھیل کر مفاد پرست قوتیں چاہے وہ سیاسی لبادہ اوڑھے ہوئے ہوں چاہے مذہبی انھیں استعمال کر جاتی ہیں اور بعد میں یہی جوان جب ان قیادتوں سے بد ظن ہوتے ہیں تو مخالفت میں حدود سے بھی تجاوز کر جاتے ہیں۔

آپ جوانوں کو بھی اپنی خامیوں پر نظر ڈالنی ہو گی اپنا محاسبہ کرنا ہو گا۔کالج اور یونیورسٹیوں میں جاری سیاسی عمل جوانوں کو بہت کچھ سکھا دیتا ہے۔جو کچھ دینی مدارس کے بارے میں میں نے اظہار کیا ہے وہی کالجوں اور یونیورسٹیوں میں جدید انداز میں ہوتا ہے۔ ہمارے اکثر جوان اس احساسِ برتری کا شکار ہو جاتے ہیں۔کہ کیونکہ وہ جدید تعلیم حاصل کر رہے ہیں لہٰذا اُن کا شعور اور حالات کو سمجھنے اور قوم کو چلانے کی صلاحیت بھی دوسروں سے زیادہ ہے۔

یہی وہ خطرناک فکر ہے کہ ملّت کے حالات بگاڑنے میں بعض اسلام نا آشنا مولویوں کے ساتھ ساتھ اس فکر کا بھی بہت بڑا حصّہ ہے۔گذشتہ چند سالوں میں یہ بات بھی مشاہدہ میں آئی کہ انتہائی منصوبہ بندی کے ساتھ جوانوں کے ذہن میں یہ بات راسخ کرنے کی کوشش کی گئی کہ سارے مولوی بیکار ہیں یہ مسائل کو نہ تو سمجھتے ہیں اور نہ حل کرنے کے قابل ہیں۔اسطرح روحانیت پر ایک ضربِ کاری لگی اور علماء اور جوانوں اور دانشوروں میں ایک خلیج حائل ہو گئی۔یہ کوئی اچھی بات نہیں ہوئی۔ہمیں یہ ذہن نشین کر لینا چاہئے کہ ہر عالم خمینی اور بہشتی نہیں ہو سکتا۔حوزۂ علمیہ برسوں تک ہزاروں علماء کی پرورش کرتا رہا

جب جا کے ایک خمینی وجود میں آیا۔ جبکہ ہماری سرزمین پر تو ماضی بعید میں بھی تشیع میں کوئی انقلابی تحریک وجود نہیں رکھتی۔

ہمیں تو صفر سے چلنا پڑ رہا ہے۔ ہمیں آج بیج بونا ہے تا کہ کل آنے والے فصل کاٹ سکیں ہم بیج بوئے بغیر کیسے ثمر بار شجر کی توقع رکھتے ہیں۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ حالات کی نخرابی کی ذمہ داری ایک دوسرے پر ڈالنے کے بجائے بھر پور طریقے سے علمی جہاد کا آغاز کر دیا جائے۔ آپ کے ہاتھ میں قلم سب سے بڑا ہتھیار ہے۔ آپ جس شعبے میں بھی تعلیم حاصل کریں اُس میں پوری مہارت حاصل کریں، اور ساتھ ہی ساتھ یہ عہد بھی کریں کہ آپ کی ساری صلاحیتیں مذہب وملّت کی فلاح کے لئے وقف ہوں گی۔ خود تعلیم حاصل کیجئے اور دوسروں کو تعلیم دیجئے اس کے ساتھ ہی ساتھ دینی مدارس کے طلباء سے آپ کا مستقل رابطہ رہنا ضروری ہے تا کہ مستقبل کے علماء سے آپ کی ہم آہنگی قائم رہ سکے اور آپ دینی طلباء کے لئے اور دینی طلباء آپ کے لئے روحانی اعتبار سے تقویت کا باعث ہوں۔

یہ تعلقات اور ہم آہنگی آپ دونوں کی روحانی تربیت کے لئے ضروری ہیں۔ اس طرح آپ تمام امور میں محتاط رہیں گے۔ اور ہر چیز کو حقیقت پسندی کی نظر سے دیکھیں گے سامراجی طاقتوں نے آپ کے خلاف اچانک سازش نہیں کی ہے بلکہ آج کی عالم اسلام کی صورتحال کئی صدیوں سے جاری سامراجی سازشوں کا نتیجہ ہے۔ آپکو بھی منصوبہ بندی کرنا ہوگی غور و فکر کے وقت کو بڑھانا ہوگا۔ سامراج نے آپکی کمزوریوں سے فائدہ اٹھایا ہے آپکو

اپنے دشمن کی کمزوریاں تلاش کرنا ہونگی جو یقیناً آپ سے زیادہ کمزوریوں کا حامل ہے۔

اخلاقی فساد کا میدان ہو یا تباہی و بربادی کی داستانیں یہ سب آپکے دشمن کی کمزوریاں ہیں۔ اب ہمیں دنیا کے سامنے انہیں کیسے پیش کرنا ہے یہ ہماری حکمت عملی پر منحصر ہے۔

آج کا مغربی معاشرہ روحانی اقدار سے عاری ہے آج خود عیسائیت از حیث مذہب اپنی بربادی پر رو رہی ہے ابھی حال ہی میں (جولائی ۲۰۰۰ء) جرمنی میں ہم جنس پرستوں نے اپنے حقوق کی حمایت میں جرمنی میں احتجاجی مظاہرے کئے جس پر پاپائے روپ بھی چلا اٹھے اور اسے انتہائی غیر انسانی فعل اور مذہب عیسائیت کی توہین قرار دیا۔ اس طرح خود امریکہ میں ناجائز بچوں کی تعداد اتنی بڑھ چکی ہے کہ وہاں کئی اداروں سے ولدیت کا خانہ خارج کر دیا گیا ہے بلکہ ماں کا نام درج کیا جاتا ہے۔

خاندانی اقدار کا یہ عالم ہے کہ بچے ماں باپ کو شادی کی اطلاع بذریعہ خط دیتے ہیں۔ دوسرے رشتوں کا تو ذکر ہی کیا خود ماں باپ کو بوڑھا ہونے پر "اولڈ ہاؤس" میں جمع کرا دیا جاتا ہے یا وہ اولاد کی لاپرواہیوں سے تنگ آکر وہ خود ہی وہاں داخلہ لے لیتے ہیں۔

عزیز جوانو! یہ صرف اشارے ہیں جو صرف اس لئے کر رہا ہوں کہ آپ بھی چاہیں تو تحقیق کے دروازے کھولیں اور پروپیگنڈہ کی جو زبردست جنگ استعمار نے ہمارے خلاف شروع کی ہوئی ہے اس کا منہ توڑ جواب دیں۔

اب تک یہ ہوتا رہا ہے کہ ہم اپنی صلاحیتیں آپس ہی کے اختلافات میں صرف

کرتے رہے ہیں اور اس میں سب شریک ہیں۔ اب بیس سالوں کے تجربے کے بعد ہمیں اتنا سیکھ لینا چاہیے کہ کالی بھیڑوں سے اپنی توجہ ہٹا کر ان بھیڑوں کو ہنکانے والے کی طرف توجہ کرنا چاہئے۔ جیسا کہ لبنان کے تجربے نے سکھایا وہاں برسوں تک آپس کی خانہ جنگی نے سوائے تباہی اور بربادی کے کچھ نہ دیا مگر جب ایک الٰہی لشکر نے اپنی ساری توجہ اصل اور مکار دشمن کی طرف کی تو کامیابی نے ان کے قدم چومے اور سامراج کو سر پر پیر رکھ کر بھاگنا پڑا۔

آپ اس انتظار میں نہ رہیں کہ کوئی باہر سے آکر آپکو اس دلدل، طوفان یا منجدھار سے نکالے گا۔ امام خمینی نے ساری دنیا کے مظلوموں کو یہ پیغام دیدیا تھا کہ "آپ یہ انتظار نہ کریں کہ کوئی آپ کے لئے انقلاب صادر کرے گا بلکہ ہر قوم کو خود اپنے لئے جدّوجہد کرنا پڑے گی"۔

دوستو انقلاب کی حمایت اور چیز ہے اور دوسروں کا دستِ نگر بن جانا اور چیز۔ راہِ امام خمینی پر چلنا اور چیز ہے اور کسی کا آلۂ کار بننا اور چیز۔ ہمیں اب حالات اور واقعات کی روشنی میں اپنی راہ متعین کرنا ہوگی۔ انقلاب کے کردار اور افراد کے کردار میں تمیز کرنا ہوگی۔ جغرافیائی سرحدیں بدلتے ہی معروضی حالات بدل جاتے ہیں۔ اسلام کے کلیّات تبدیل نہیں ہوتے، مگر ہر جگہ کے ثقافتی تقاضوں سے ہم آہنگ ہونا بھی مذہبی ضروریات میں سے ہے۔

قرونِ اولیٰ میں جہاں بھی اسلام کا پیغام پہنچا اس نے وہاں کی اُن علاقائی اور ثقافتی رسم و رواج سے کوئی سروکار نہ رکھا جو اسلام کے کلی قوانین سے نہیں ٹکراتی تھیں۔ اسی لئے آج دنیا بھر کے مسلمان اگرچہ کہ دین کے اعتبار سے ایک رشتہ میں منسلک ہیں، لیکن ہر جگہ

کے رہن سہن کے آداب اور کچھ مخصوص رسم ورواج ہیں جنہیں اسلام نے ختم نہیں کیا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ جو رسوم اسلام کے منافی تھیں انہیں فوراً ختم کر دیا گیا۔یاان میں اصلاح کے پہلو تلاش کر لئے گئے۔

مجھے امید ہے کہ میری یہ مختصر سی معروضات آپ عزیز جوانوں کے لئے فکر کے نئے دریچے کھولے گی اور آپ نئے عزم وحوصلے کے ساتھ دشمن سے مقابلے کی تیاری کا آغاز کریں گے۔

عزادارانِ حسینؑ!

آپ ہی وہ حسینی لشکر ہیں جو تشیع کو عطیہ الٰہی کی صورت میں ملا ہے۔ یوں تو ساری ملتِ جعفریہ ہی اس عنوان کی مصداق ہے مگر موجودہ دور میں عزاداری اپنی ارتقائی منزلیں طے کرتی ہوئی اس مقام پر آچکی ہے کہ اب باقاعدہ اس میں شعبہ بن چکے ہیں۔ علماء، خطباء، ذاکرین، مرثیہ خواں، نوحہ خواں، بانیانِ مجلس، ماتمی انجمنیں، اسکاؤٹس کے دستے اور اس کے علاوہ بھی بہت سے شعبے۔

ہمیں یقینِ کامل ہے کہ ہم وہ عزادارانِ حسینی ہیں جو مادرِ حسینؑ کی دعا کا حاصل ہیں لہٰذا ہمیں جب تک جینا ہے غمِ حسینؑ کے ساتھ جینا ہے۔

لیکن یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ صرف مجلسِ عزا برپا کر لینے سے ہم سب کی ذمہ داری پوری ہو جاتی ہے؟ اس عزاداری کو لے لیجئے بعض جگہ بلکہ ہر جگہ جھگڑا اس بات پر

ہے کہ ایک مخصوص ٹولہ چاہتا ہے کہ عزاداری رک جائے۔ اس مسئلے پر تنازعہ آگے بڑھتا ہے نوبت جدال تک آتی ہے کتنے ہی عزادار جامِ شہادت نوش کر چکے ہیں۔ کتنے ہی عزاداری کی خاطر پابندِ سلاسل ہو چکے ہیں۔ کیا ان شہداء کے ورثاء کی سرپرستی اور قیدیوں کے مسائل حل کرنا ہماری ذمہ داری نہیں ہے، کیا اس مخصوص منظّم شیطانی ٹولے کے خلاف قوم کو منظّم کرنا ہماری ذمہ داری نہیں ہے ؟

لیکن عجیب بات یہ ہے کہ ہماری ہی صفوں میں یہ صدائیں بلند ہونے لگتی ہیں کہ یہ سیاست ہے اور ہمارا سیاست سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اگر یہ سیاست ہے اور سیاست سے کوئی تعلق نہیں ہے تو یہ مسائل کون حل کرے گا؟ کیسے حل کریگا؟ یہ مسائل آپ کو اور ہم سب ہی کو مل کر حل کرنے ہیں۔

بتایئے کیا یہ عزاداری خود ایک احتجاج نہیں ہے۔ کیا یہ جلوس عزا احتجاجی جلوس نہیں ہے۔ ہم تو پیدا ہی ظلم کے خلاف احتجاج کرنے کے لئے ہوئے ہیں لیکن ایک منظّم طریقے سے عزاداری کو صرف ایک رسمی کاروائی تک محدود کرنے کی سازش پر عمل ہو رہا ہے۔ اور اس عبادت کو رسمی کاروائی میں تبدیل کیا جا رہا ہے۔

عزادار! جو پیدائشی طور پر ایک انقلابی ہوتا ہے رفتہ رفتہ اسے توہم پرست بنایا جا رہا ہے۔ عزاخانے جو انقلاب کا مرکز ہیں چند لوگوں کی جاگیریں بنتے جا رہے ہیں۔ اپنے اپنے مراکز میں مجمع زیادہ اکھٹا کرنے کے لئے طرح طرح کے ہتھکنڈوں کو استعمال کیا جا رہا ہے۔ اور باعمل علماء اور ذمہ دار خطباء اور ذاکرین کے بجائے ایسے افراد کو دعوت دی جاتی ہے جو نہ

صرف یہ کہ علمی طور پر کمزور ہوتے ہیں بلکہ اپنی کمزوریوں پر پردہ ڈالنے کے لئے عزاداروں اور عزاداری کے ساتھ کھیل کھیلتے ہیں۔

افسوسناک پہلو یہ ہے کہ اگر کوئی ایسے فریبی افراد کی فریب کاریوں کا پردہ چاک کرنا چاہتا ہے تو فوراً اسے شیعیت سے خارج کرنے اور دشمنِ عزاداری ہونے کا سرٹیفیکیٹ دے دیا جاتا ہے۔ ہماری ملت کو اتنے تجربات سے گزرنے کے بعد اب اتنا سادہ نہیں ہونا چاہئے کے ہر مفاد پرست اہلِ بیتِ رسولؐ سے محبت کی آڑ میں اسے اپنے مقاصد پورے کرنے کے لئے بیوقوف بنادے۔

یہ ایک ایسا موضوع ہے جس پر مجھے بڑے احتیاط سے قلم اٹھانا پڑ رہا ہے کیونکہ میں جانتا ہوں کہ کچھ افراد اس تحریر کو محض اس لئے پڑھیں گے کہ اس میں سے کوئی ایک آدھ ایسا جملہ انہیں مل جائے جسے وہ اڑالیں اور عوام کے درمیان اسے پھیلا کر مجھے عزاداری کا مخالف اور نہ جانے کیا کیا مشہور کرادیں۔

اے عزادارانِ حسینؑ! آپ ایسے دیں فروش اور ضمیر فروش افراد سے ہر وقت ہوشیار رہیں جو آپ کے سامنے بڑے عزادار اور اہلِ بیتؑ کے بڑے چاہنے والوں کا روپ دھار کر آتے ہیں اور دین اور ملت کی پشت میں چھرا گھونپتے ہیں۔ ان کی حرکتیں کفارِ قریش کے ان سرداروں سے ملتی جلتی ہیں جو خدا کے گھر میں بیٹھ کر لوگوں کو خدا سے گمراہ کرتے تھے۔

ان کی ایک علامت یہ ہے کہ یہ ہر وقت فتنہ آرائی پر تُلے نظر آتے ہیں۔ اختلافات

کو ہوا دینا، غلط فہمیاں ایجاد کرانا، لوگوں کو مغالطہ میں ڈالنا، متشابہ چیزوں سے محکمات کو رد کرانا، احکام الٰہی کا مذاق اڑانا، بے عملی کی ترغیب دینا، واجبات کے خلاف ہرزہ سرائی کرنا، علماء کو ہدف تنقید بنانا، ایرانی ایجنٹ کا لیبل لگانا، مبلغینِ دین کی تحقیر کرنا، دین کے مسلمات کا انکار کرنا یہ سب ان کے پسندیدہ مشاغل ہیں۔ یہ بات بات میں کفارِ قریش کا یہ جملہ دہراتے ہیں کہ ہم تو پہلی بار دیکھ رہے ہیں یا پہلی بار سن رہے ہیں ہمارے باپ دادا نے تو یہ نہیں کیا تھا۔ عزیزو! یہ دین کا مسئلہ ہے ہمیں قدم قدم پر محمدؐ و آلِ محمدؑ کی شریعت کی پاسداری کرنا ہے۔ اور ہمارا مقصد ہر عبادت سے خدا اور اہل بیتؑ کی خوشنودی ہونا چاہیئے نہ کہ لوگوں کی۔

اے عاشقانِ حسینؑ! ذرا ٹھنڈے دل سے غور کیجئے کہ دین کسی کے باپ دادا کی سنت کا نام ہے یا رسول خداؐ اور آئمہ طاہرینؑ کی تعلیمات کا نام ہے؟ دین کو خدا، رسولؐ اور آئمہ معصومینؑ کی تعلیمات کے سائے میں پرکھا جائے گا نہ کہ کسی کے باپ دادا کے عمل کی روشنی میں اور پھر باپ دادا پر بھی تو جھوٹا الزام ہے۔ کیا ہمارے اور آپ کے باپ دادا یہی عمل انجام دیا کرتے تھے؟

آپ آج ہی کے دور کو دیکھ لیجئے کہ کتنی چیزیں ابھی چند سال کی پیداوار ہیں جن کا ہمارے باپ دادا کے عمل سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں جزئیات میں پڑنا نہیں چاہتا آپ خود ایام عزا میں مشاہدہ فرماتے ہیں کہ عزاداری کو اپنے ذاتی اور گروہی مقاصد کے لئے کس بے دردی سے استعمال کیا جاتا ہے۔ کیا منبر سے لے کر ماتمی دستوں تک مقابلے بازی نہیں ہے اور اس مقابلے بازی میں ہم حدود سے کتنا تجاوز کر جاتے ہیں۔ آپ ذرا سی بھی توجہ دیں گے تو

میری بات کی حقانیت ثابت ہو جائے گی۔

میری باتوں کا برا مت منایئے میں آپ ہی میں کا ایک فرد ہوں اور جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ ایک درد مند دل کی پکار ہے۔ یہ تحریر کسی فرد یا گروہ کی حمایت یا مخالفت یا دل آزاری کے لئے نہیں لکھ رہا ہوں بلکہ خود اپنے محاسبے کے لئے اور آپ کی توجہ اپنے اپنے محاسبے کی طرف دلانے کے لئے لکھ رہا ہوں۔ اپنی آنے والی نسلوں کے اس سوال کے جواب میں لکھ رہا ہوں جو کل سوال کریں گے کہ جب دین میں تحریفات کا بازار گرم ہو رہا تھا تو سب خاموش کیوں تھے ؟ لہٰذا میں حرف حق کہہ کر لب و گوش پر خاموشی سجائے رکھنے کا الزام مسترد کر رہا ہوں۔

یہاں افراد کا نام لئے بغیر ایک واقعہ نقل کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ کچھ عرصے پہلے کی بات ہے ایک جگہ کچھ علماء اور ماتمی انجمنوں کے کچھ نمائندے جمع ہوئے وہاں ایک معروف اہلِ منبر نے ماتمی انجمنوں پر تنقید شروع کر دی اور زور اس بات پر تھا کہ موجودہ دور میں ماتمی انجمنیں بے راہ روی کا شکار ہیں اس پر وہاں موجود ماتمی انجمنوں کے نمائندے نے ایک ٹھوس جواب دیا کہ قبلہ ہمارا کام ہے فرش عزا بچھانا ہم عزاداری کہ لئیے خرچہ کرتے ہیں اور ذاکر کے منہ مانگے دام بھی ادا کرتے ہیں اب آپ کا کام ہے کہ آپ منبر سے کیا دیتے ہیں۔

واقعی سب سے بڑی ذمہ داری اہلِ منبر کی ہے کہ وہ منبر سے قوم کی بالخصوص جوانوں کی اصلاح کا کام انجام دیں۔ کیا وجہ ہے کہ مجلس کے دوران جوانوں کا ایک بڑا حصہ امام

بارگاہ سے باہر ہوتا ہے اور صرف مصائب کے دوران مجلس میں حاضر ہوتا ہے وجہ یہی ہے کہ انہیں مجلس میں کوئی نئی بات معلوم ہونے کی امید نہیں ہے، یا کوئی دلچسپی نہیں ہے اور کبھی صورتحال اس سے بالکل برعکس ہوتی ہے بعض مجالس میں بات تو کوئی نئی نہیں ہے مگر پڑھنے والے کا انداز ایسا ہے کہ وہ اپنے فن کا مظاہرہ کر کے ہزاروں کا مجمع اٹھاتا اور بٹھاتا رہتا ہے۔ بہت ہی معذرت اگر میرا جملہ برا لگا ہو لیکن میں ایسے کئی افراد کو جانتا ہوں محض اس لئے مذہب تبدیل کر کے ذاکری کر رہے ہیں کہ اس میں محنت کم اور آمدنی زیادہ ہے اور یہ تبصرے بھی برملا کرتے ہیں کہ اس قوم کو بیوقوف بنانا سب سے زیادہ آسان ہے۔ان لوگوں نے کوئی ٹھوس کام کرنے کے بجائے عامۃ المومنین کو مناظرے میں الجھادیا اور منبر کو نفرتیں پھیلانے کا ذریعہ بنادیا۔

آج وہ منبر جو مکتب اہلِ بیتؑ کی ترویج کا سب سے بڑا ذریعہ ہے اُسی سے تشیع کی بنیادیں متزلزل کرنے کی کوششیں کی جارہی ہیں، اِس سامراجی سازش پر عملدرآمد کیا جارہا ہے کہ ان کے اہل منبر کو خرید لو علماء اور ملت کے درمیان دراڑیں ڈال دو، گمنام اور جاہل مصنفین سے بنیادی عقائد کے خلاف تحریریں لکھواؤ، تشیع کی طاقت کے سب سے بڑے سرچشمے مرجعیت پر ضربِ کاری لگاؤ اور شیعیت کو تباہ کردو اور اگر یہ مکمل طور پر تباہ نہ بھی ہوسکے تو اسے محض رسم ورواج تک محدود کردو۔

صدیوں سے سامراج اور سامراجی گماشتے مرجعیت کی طاقت کے آگے بے بس رہے ہیں۔ آیۃ اللہ شیرازی کی تحریم تمباکو سے لے کر انقلابِ اسلامی کے برپا ہونے تک دنیا

گواہ ہے کہ شیعہ کتنا ہی بے عمل کیوں نہ ہو لیکن جب بھی مرجعیت، اسلام اور تشیع کے دفاع کے لئے میدان میں آئی پوری ملت بغیر جغرافیائی سرحدوں کا لحاظ کئے مراجع عظام کی پشت پناہ بن گئی اور ہر محاذ پر سامراجی عزائم کو ناکام بنادیا۔

آپ عزادارانِ حسینؑ! کربلا کی صدائے **ھل من ناصرٍ ینصرنا** کا جواب ہیں۔ آپ آج کے دور میں عزاداری کے ذریعے نصرت حسینؑ میں مشغول ہیں۔ ایک حقیقی ناصر حسینؑ کو یزیدی سازشوں پر نظر رکھنی چاہئے۔ دشمن جانتا ہے کہ وہ سامنے آکر آپ کو شکست نہیں دے سکتا، اسی لئے اس نے منافقت کا لبادہ اوڑھ لیا ہے دین فروش اور ضمیر فروش افراد کے ذریعے مقام مرجعیت پر ضرب لگارہا ہے۔

آپ خود سوچئے کہ غیبت کبریٰ کے دور میں اگر ہم اس ایک وحدت کے مرکز سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے تو پھر ہمارا کیا ہوگا۔ غیبت کے دور میں کون ہماری رہنمائی کرے گا بے شک ہمارا امامؑ ہمارا حقیقی سرپرست و رہنما ہے لیکن ہم لوگ وسیلے کے قائل ہیں کیا کسی بھی دور میں ایسا ہوا یا ہو سکتا ہے کہ امامؑ فرداً فرداً لوگوں کی رہنمائی کرے یقیناً یہی مراجع عظام وہ وسیلہ ہیں جن کے ذریعے سے احکام آئمہؑ ہم تک پہنچتے ہیں۔

استعماری طاقتیں کروڑوں ڈالر خرچ کر رہی ہیں تاکہ ہماری صفوں میں انتشار کو ہوا دی جاسکے، ہم مسلسل چھوٹے چھوٹے گروہوں میں تقسیم ہوتے چلے جائیں اور پھر نام و نہاد جہادی طاقتوں کے ذریعے ہماری ہر آبادی کو کرخ بنادیا جائے۔ [1]

[1] حاشیہ کی عبارت صفحہ نمبر ۸۵ پر ملاحظہ فرمایئے۔

حسینی سپاہ کو اپنے دفاع کی طرف سے اتنا غافل نہیں ہونا چاہئے۔ اب جب کہ ہم چاروں طرف سے خطرات میں گھر چکے ہیں دشمن داخلی اور خارجی دونوں محاذوں پر مسلسل ہمیں نقصان پہنچا رہا ہے ہمیں دوست اور دشمن میں تمیز کرنا پڑے گی ہمیں اپنی صفوں میں موجود کالی بھیڑوں کا راستہ روکنا پڑے گا۔

سب سے خطرناک حربہ جو یہ منافقین استعمال کرتے ہیں وہ لوگوں کے جذبات کا استحصال کرنا ہے۔ یہ جانتے ہیں کہ عزاداری اور مولاؑ کے نام پر ہم جب چاہیں گے جیسے چاہیں گے عزاداروں کو استعمال کر جائیں گے۔ اور کر رہے ہیں کہ عزاداری میں اپنے مرضی کی نت نئی اور جاہلانہ باتوں کو شامل کر کے دوسروں کو یہ کہنے کا موقع فراہم کر رہے ہیں کہ یہ عقل و ہوش و خرد سے عاری اوہام پرستوں کا گروہ ہے جس کا عقل و منطق سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔

مگر اے ماتمی جوانو! یہ کب تک ہوتا رہے گا؟ کیا آپ غور و فکر نہیں کرتے کہ جو لوگ اس قسم کہ ہتھکنڈے استعمال کرتے ہیں وہ خود کس کردار کے مالک ہیں، خود ان کے قول و فعل میں کتنا تضاد ہے ان کالی بھیڑوں کو ایک بڑا فائدہ (Advantage) وہ نام نہاد ملاّ پہنچاتے ہیں جو جامہ دین میں دین کا سودا کرتے ہیں، یہ منافقین انھیں ملاؤں کے کردار کو لوگوں کے سامنے پیش کر کے ملّت کو علماء سے گمراہ کر دیتے ہیں۔

اس بارے میں تو میں کتاب کے شروع میں عرض کر چکا ہوں کہ یہ اسلام نا آشنا ملاّئیت اسلام کے لئے بالخصوص تشیع کے لئے ایک بلائے بے درماں ہے۔

مجھے یقین ہے کہ میرے ماتمی جوان میری گزارشات کو اُسی خلوص کی نظر سے دیکھیں گے جس خلوص سے خدا کو گواہ کر کے میں یہ تحریر میں لا رہا ہوں۔

۱؎ (حاشیہ صفحہ ۸۳) بغداد کی وہ شیعہ آبادی جسے عباسیوں کے دور میں اس طرح تاراج کیا گیا تھا کہ اس کا نام و نشان مٹ گیا۔ (خلیفہ مستعصم باللہ کے دور میں ۶۴۰ھ تا ۶۵۵ھ)

لیکن مظالم کی ان داستانوں سے بھی ہم نے عبرت نہیں حاصل کی اور یہ واقعات تاریخ کی تہہ بہ تہہ گرد میں دب کر رہ گئے۔ لیکن ہم پر یہ ظلم کا سلسلہ آج بھی جاری ہے، اور یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہے گا جب تک ہم اعلائے کلمۃ الحق کرتے رہیں گے، جب تک ہم اسلام کو اپنی زندگی کی غایتِ اولیٰ قرار دیتے رہیں گے جب تک ہم دنیا پر دین کی حکمرانی کی کوششیں جاری رکھیں گے، جب تک سامراجی اور استعماری قوتوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دنیا بھر کے مظلوموں اور مستضعِفوں کی حمایت جاری رکھیں گے، جب تک ہم ساری دنیا پر اسلام کا پرچم لہرانے کی سعی کرتے رہیں گے، جب تک ہم شیطانِ بزرگ امریکہ کی برتری کا انکار کرتے رہیں گے اور جب تک ہم ہر دور کے یزید کے خلاف احتجاج کرتے رہیں گے۔ ہماری عزاداری اُس دور کے یزید سے لے کر عصر حاضر تک کے یزیدی فکر رکھنے والوں کے خلاف مسلسل احتجاج ہے۔ لہٰذا اسلام دشمن قوتوں کا سب سے بڑا ہدف ہی عزادار اور عزاداری سید الشہداء ہیں۔

❀ ❀ ❀

خطباء ذاکرین، ادیبوں اور شعراء کرام سے!

جس طرح ہر لشکر ڈویژنوں، پلٹنوں اور دستوں میں تقسیم ہوتا ہے اور ہر دستہ، پلٹن اور ڈویژنوں کے درجہَ بہ درجہَ سالار ہوتے ہیں۔ آپ خطباء کرام، ذاکرینِ عظام، ادیبانِ محترم اور شعراء والا مقامِ حسینی لشکر کے دستوں کے سالاروں کی حیثیت کے حامل ہیں۔

یہی مقام ہمارے محترم نوحہ خوان حضرات اور مرثیہ خوان حضرات کو حاصل ہے۔ آپ کچھ دیر کے لئے یہ تصوّر کر لیجئے کہ آپ کو ایک دستہ کا سردار مقرر کر دیا گیا ہے تو آپ اپنے دستہ کی سالاری کیسے کریں گے؟ آپ سب خدمت گزاران مکتب اہل بیتؑ ہیں۔ آپ پر اس لشکر کو منظّم کرنے کی سنگین ذمہ داری ہے آپ سب اپنے اپنے میدان کے

سالار ہیں آپ کا قوت بیان، آپ کی تحریر، آپ کا کلام، آپ کا انداز بیان، آپ کی خوبصورت آواز، یہ سب آپ کے پاس زہراؑ کی امانت ہیں۔

بارگاہِ حسینیؑ سے آپ کو اور ہم کو جو عزت و وقار عطا ہوا ہے وہ دنیا کی کسی بارگاہ یا دربار سے نہیں مل سکتا۔ پھر ہم اس عظیم نعمت الٰہی کا شکر کیسے ادا کریں۔ شکرانِ نعمت کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اس نعمت کو انہی کی خدمت میں سرف کیا جائے جن کی یہ عطا ہے۔ اپنی جوان نسل کی تربیت کی ذمہ داری کسی ایک فرد یا ایک عالم کی نہیں ہے بلکہ یہ تو ہم سب کی مشترکہ ذمہ داری ہے۔ ان کی ذمہ داری ہے جو شعور و آگاہی کی دولت سے مالا مال ہیں جو سینے میں دردِ ملّت رکھتے ہیں۔

آپ کے پاس منبر ہے آپکے پاس قلم ہے آپ کے پاس فکر ہے زورِ بیاں ہے آواز ہے یہ سب وقف کر دیجئیے ملّت کے حالات بدلنے کے لئے۔ ایک شہرت وقتی اور زمانی ہے اور ایک ابدی اور لافانی ہے ایک عزت صرف دنیا تک محدود ہے اور ایک عزت دنیا و آخرت کا احاطہ کئے ہوئے ہے ایک بار ہم صرف لوگوں کے سامنے سرخرو ہو کر خوش ہو جاتے ہیں اور ایک بار خدا رسولؐ اور آئمہؑ معصومین کے سامنے سرخروئی کی بات ہے۔

یہ فیصلہ کی گھڑی ہے کہ ہمیں کونسی شہرت عزت اور سربلندی درکار ہے، درست ہے کہ راہ حق بہت مشکل اور دشوار گزار ہے، سخت ہے امتحان بار ہے مگر کیا ہمارے پاس اسوۂ حیدرِ کرارؑ، کربلا اور کربلا والوں کا کردار نہیں ہے اگر واقعی ہم کربلا والے ہیں اور ایک راسخ العقیدہ حسینی ہیں تو ہمیں اسی سخت اور دشوار گزار راستے کا انتخاب کرنا ہوگا جو

ابوذر غفاری، میثمِ تمار اور قنبر جیسے علیؑ کے غلاموں نے کیا تھا، اس راہ پر چلنا پڑے گا جس راہ پر چل کر حبیب ابنِ مظاہر ساری رکاوٹیں عبور کر کے اپنے مولا کے قدموں میں پہنچ گئے تھے۔ اس طرح اپنے آپ کو ظلمات سے نکالنا پڑے گا جس طرح محرّ ظلمات سے نکل کر نور کی طرف گیا تھا۔

آج انتہائی معذرت اور افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ بعض جگہ ہمارے منبر کا معیار انتہائی گر چکا ہے، آدابِ منبر کا کوئی پاس نہیں رہا ہے علمی سطح اس حد تک گر چکی ہے کہ بعض اہلِ منبر تشیع کے بنیادی عقائد سے بھی کما حقہ آگاہی نہیں رکھتے سارا زور صرف اندازِ بیاں اور چند رٹے ہوئے واقعات کو بار بار گھما پھرا کر پیش کرنے پر ہوتا ہے۔ یہ formal مجالس ہم میں انقلابی روح بیدار نہیں کر سکتیں، کردار سازی منبر کا حق ہے، حسینؑ نے ہمیں تاریخ میں زندہ رکھا ہے تو ہمارا بھی فرض ہے کہ اسوۂ حسینؑ، مقصد حسینؑ اور منشور حسینؑ کو زندہ رکھیں۔

ایک مسجد میں نماز کی امامت کرنے کے لئے پیش امام کے لئے کتنی شرائط رکھی گئی ہیں مگر منبر پر بیٹھ کر ہزاروں انسانوں کے ذہنوں پر حکومت کرنے والے کے لئے ہم کسی شرط کے قائل اور پابند نہیں ہیں۔ ایسا قطعاً نہیں ہونا چاہئے اور اس سلسلے میں بانیانِ عزاء پر بھی بھاری ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ فرش عزاء بچھانا محض رسمی کاروائی نہیں ہے اور نہ ہی محض مجمع اکھٹا کرنا مقصود ہوتا ہے بلکہ فرش عزاء بچھانے کا مقصد ایک طرف غم منانا اور دوسری طرف پیغامِ حسینیؑ کو دنیا تک پہنچانا ہے۔

اب آج کے دور میں ہم یہ پیغام کس طرح پہنچائیں یقیناً جب تک ہمارے اہل منبر اپنے بیان کو جدید دور کے تقاضوں سے ہم آہنگ نہیں کریں گے ،بدلتی ہوئی اقدار کا لحاظ نہیں کریں گے، سماجی رشتوں کا پاس نہیں رکھیں گے کس طرح یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ لوگ ہماری مجلسوں کا رخ کریں۔ ہمارا انداز تو ایسا ہونا چاہئے کہ لوگ خود بہ خود کھنچ کر مکتب اہلبیت کی طرف آجائیں نہ کہ ان کے دلوں میں نفرتیں بوئی جائیں یہ درست ہے کہ ساری دنیا نے نہ تو کبھی حق کو تسلیم کیا ہے اور نہ سب نے ساتھ دیا ہے لیکن ہمیں تو اپنی ذمہ داری احسن طریقے سے پوری کرنا ہوگی۔

اس سلسلے میں کیا کرنا چاہئے ؟ ابھی نصف صدی پہلے تک لکھنؤ میں ایسی اکیڈمی موجود تھی (اور میری اطلاعات کے مطابق برسوں کی زبوں حالی کے بعد ایک بار پھر اس اکیڈمی کو نئی زندگی ملی ہے) جہاں ایسے واعظ اور خطیب تیار کئے جاتے تھے جو منبر پر جاکر پوری ذمہ داری کا مظاہرہ کرتے تھے۔ مدرسۃ الواعظین، ناظمیہ اور سلطان المدارس لکھنؤ ماضی میں یہ خدمات انجام دیتے رہے ہیں۔

یہاں بھی ہمیں واعظین اور خطباء کے لئے ایک ایسی اکیڈمی قائم کرنا پڑے گی جو چند سال تک باصلاحیت افراد کی تربیت کے فریضے کو انجام دے اور انہیں باقاعدہ سند دے کر فارغ کیا جائے تاکہ وہ معاشرے کی ضروریات کو پورا کر سکیں اور یہ جو آجکل (Short-cut) شارٹ کٹ راستہ نکلا ہوا ہے کسی بھی مشہور ذاکر کی چند کیسٹوں کا رٹہ لگا کر یا چند معروف خطباء کی مجالس یاد کر کے علامہ کا لیبل لگوالیا نہ پڑھنے کی ضرورت اور نہ ہی

مدرسہ کی حاجت (حقیقی خطباء اور ذاکرین میری اس بات کے مصداق نہیں ہیں) جہاں عزاداری پر ہم کروڑوں بلکہ اربوں روپے خرچ کرتے ہیں وہیں ایسی اکیڈمی اور ایسے مدارس کا قیام بھی عزاداری ہی کی خدمت کا حصّہ ہیں ورنہ جس ڈگر پر آج ہمارا منبر چل رہا ہے اگر صورتحال کے آگے بند نہ باندھا گیا تو کچھ عرصے کے بعد منبر کا اللہ ہی حافظ ہوگا۔

ہمارے بعض صوبوں میں تو یہ حال ہے کہ گانے بجانے والے محرم میں گانا بجانا چھوڑ کر منبر پر کودنا شروع کر دیتے ہیں اور انہیں یہاں زیادہ پذیرائی ملتی ہے اور بقول ان کے گانے بجانے سے زیادہ ہمیں ان دو ماہ میں عزت شہرت اور دولت مل جاتی ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ان سب کہ بدلے اس نے اس قوم کو کیا دیا۔ تاریخی واقعات کو مسخ کر کے پیش کرنا، گھڑی ہوئی روایات کو پیش کر کے واقعہ کربلا کو دنیا کی نظروں میں مشکوک بنانا اور اپنی بے عملی کی توجیہہ و تاویل پیش کرنے کے لئے ساری قوم کو بے عملی کی راہ پر چلنے کی دعوت دینا۔

کیسے کیسے لوگ منبر پر نظر آنے لگے
زیرِ منبر بیٹھئے توہینِ منبر دیکھئے

آپ اس قوم کے دانشور ہیں آپ کو ہی قوم کو اس دلدل سے نکالنا ہے، خدا بھی کسی قوم کی تب ہی مدد کرتا ہے جب وہ خود اپنی مدد کے لئے آمادہ ہو۔

آیئے ہم سب مل کر عہد کریں کہ اپنے عہد و وفا کو پورا کریں گے اپنی ذمہ داریوں

سے کماحقہ عہدہ بر آہوں گے اور اس مظلوم ملّت کے خلاف ہونے والی ہر سازش کو ناکام بنا دیں، آیئے اپنے جزئی اختلافات کو بھلا دیں اس طرح صف بندی کر لیں گویا سیسہ پلائی ہوئی دیوار، بلکہ کربلا کی دیوار جس سے ٹکرا کر یزیدیت پاش پاش ہوتی رہی ہے اور ہوتی رہے گی۔

کنیزانِ سیدّہ و زینب سلام اللہ علیھما سے !

عزاداریٔ سید شہداء کے فروغ میں آپکا حصّہ مردوں سے کم نہیں ہے بلکہ بعض جگھوں پر آپ مردوں سے بھی پیش پیش نظر آتی ہیں۔

آپ نے کبھی سوچا کہ مردوں سے زیادہ آپ نسلوں کی ذہنی ، جسمانی پرورش کی ذمہ دار ہیں ہر بچہ ماں سے اسی لئے زیادہ مانوس ہوتا ہے کہ وہ تربیت کے ابتدائی دور کا بڑا حصّہ ماں کے ساتھ گزارتا ہے گھر میں ہونے والی تمام باتوں کا برہ راست اثر لیتا ہے اور یہ تمام باتیں اسکے دل پر مرتے دم تک اپنے نقش برقرار رکھتی ہیں۔ آپ جو کچھ بھی اپنی اولاد کو دیں گی وہی آپکی اولاد آگے بڑھائے گی۔ انسان پر مذہب کا ابھرنے والا پہلا نقش ماں کی آغوش میں ثبت ہوتا ہے۔

اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ وہ شادی بیاہ کی رسومات ہوں یا عزاداری کی، کسی کے

سوئم، چہلم کا مسئلہ ہو یا میلاد و مجلس کا خواتین کے نقوش اتنے گہرے ہیں کہ مرد بھی ان معاملات میں خواتین کی تقلید کرتے ہیں جو سراسر باطل ہے۔ آج ہمارے معاشرے میں دو شرعیں رائج ہیں ایک شرع محمدیؐ اور دوسری شرع نسواں یعنی خواتیں کی اپنی اختراع کی ہوئی شرع کہ مثلاً سوئم کس دن ہونا چاہئے اور چہلم کس دن ہونا چاہئے، مہندی مانجھا کے بغیر شادی کا تصور ادھورا ہے، مرد نے سہرا ہی نہیں باندھا تو نکاح کیسے ہوگا۔ گذشتہ سال تبرّک میں حلیم بانٹا گیا تھا اگر اس بار نہ بانٹا تو مولا ناراض ہو جائینگے، فلاں امام بارگاہ پر منّت جلدی پوری ہوتی ہے اور فلاں جگہ کے علم پر مراد جلدی آتی ہے، مگر کیا ساری امام بارگاہیں امام حسینؑ کی نہیں ہیں مگر کیا سارے علم حضرت عباس علمدارؑ سے منسوب نہیں ہیں، نجف مشہد کربلا اور دیگر مزارات معصومین کو چھوڑ کر جنکی خاص فضیلتیں روایات میں وارد ہوئی ہیں تمام امام بارگاہیں تمام علم تمام زیارات مقدّس اور متبرّک ہیں۔

اپنی محترم ماؤں بہنوں سے انتہائی معذرت کے ساتھ اتنی گزارش ہے کہ اپنی شرع تشکیل نہ دیں بلکہ شرع محمدیؐ اور فقہ جعفری کو سمجھنے کی کوشش کریں، آپکی ضعیف الاعتقادی اور توہم پرستی کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ مفاد پرست لوگ پہلے آپ پر ہی ہاتھ ڈالتے ہیں اور جو بات بھی مشہور کروانی ہو چند خواتین تک اس کا پہنچا دینا کافی ہوتا ہے۔ بعض اوقات محض مجمع اکھٹا کرنے کی خاطر اہلِ بیتؑ کے نام کو آڑ بنا کر آپ کو استعمال کر لیا جاتا ہے۔

خوابوں کے سلسلے ہی کو لے لیجئے روز کوئی نہ کوئی خواب دیکھتا ہے کہ اسے بشارت ہوئی ہے یہ کرو کسی کو بشارت ہوئی ہے وہ کرو، بات صاف اور واضح ہے کسی بھی عام انسان کا

خواب دوسرے انسان کے لئے حجت نہیں ہے یہ کوئی معصوم کا خواب نہیں ہے کہ اس پر ہر شخص عمل انجام دے۔ آپ نے خواب دیکھا ہے آپ ذمہ دار ہیں، آپ کا خواب حکم خدا یا وحی الٰہی نہیں ہے جس پر عمل دوسروں پر بھی واجب ہو۔

ہمارا مذہب خوابوں کی دنیا کا مذہب نہیں ہے یہ حقیقی دنیا میں عمل کے لئے آیا ہے۔

تو آپ اے کنیزانِ جناب سیدہؑ و جناب زینبؑ خدارا اپنے عظیم مقام کو پہچانیں، آپ کو اپنی آغوش میں امام کے سپاہیوں کی تربیت کرنا ہے اس لئے آپ کی خود اپنی تربیت اور عملی صلاحیت اتنی ہونا چاہئے کہ آپ دوسروں کو جہل اور گمراہی سے باہر نکال سکیں۔

کربلا میں موجود بیبیوں نے کس طرح اپنے راج دلاروں کو موت کے حوالے کر دیا تھا اور ان کے بچے بھی کس طرح خوشی خوشی شہادت حاصل کرنے کے لئے تیروں اور تلواروں پر ٹوٹ پڑے تھے یہ جذبہ حسینؑ کی حقیقی معرفت کی وجہ سے پیدا ہوا تھا۔

آج بھی مذہب و ملّت کو ایسی ہی آغوش کی ضرورت ہے جو اپنی گود میں مختار صفت بچوں کی پرورش کریں۔ انہیں توہم پرست ماحول میں پالنے کے بجائے مجاہد بننے کا درس دیں، انہیں لوریوں میں شہیدوں اور دلیروں کی داستانیں سنائیں تاکہ جب دین پر وقت پڑے تو یہی دلیر ماؤں کی آغوش کے پروردہ بچے قہر الٰہی بن کر دشمن پر ٹوٹ پڑیں اور کربلا کی ماؤں کی طرح ان کی مائیں بھی خدا کی بارگاہ میں سرخرو ہو جائیں۔

اے کنیزان زہراؑ و پیروان زینب و اُمِ کلثومؑ یہی وہ وقت ہے جب آپ کو کئی قدم

آگے بڑھ کر کام کرنا ہوگا۔ عورت کی بہترین مسجد اسکا گھر ہے، عورت کی جنت اسکا نشیمن ہے ، عورت کی زینت و زین اسکا شوہر اور اسکے بچے ہیں لیکن جب بھی قوم و مذہب پر وقت پڑا مردوں کا حوصلہ بڑھانے کے لئے ان کی غیرت و حمیتؔ کو جگانے کے لئے انہی خواتین نے کردار ادا کیا ہے۔

تاریخ کے ہر ہر موڑ پر چاہے نبوت کی امداد کا مسئلہ ہو، چاہے امامت کے حق کے دفاع کا معاملہ ہو، چاہے دربار ہو چاہے بازار ہر جگہ یہی کمزور عورت باطل کی شکست کا سامان بن گئی، یہی عورت ایک خاتون خانہ سے مرد میدان میں تبدیل ہو گئی۔

آج آپکو اپنے کردار کا تعین کرنا پڑے گا کیسی زندگی گزاری جائے زمین پر رینگنے والے کروڑوں اربوں کیڑوں کی مانند جو دنیا میں آئے، مادّی ضرورتوں کو پورا کیا اور چلے گئے نام و نشان تک مٹ گیا۔ جیسے کہ بے شمار لوگ ایسی ہی زندگی کی آرزو کرتے ہیں جو صرف مادّی خواہشات کی تکمیل تک محدود ہوتی ہے۔ اور ان خواہشات کی تکمیل کو وہ زندگی کا حاصل جانتے ہیں یا آپ ایسی زندگی چاہتی ہیں جو کبھی نہ ختم ہونے والی ہو یعنی حیات ابدی۔

یقیناً ہر ذی عقل ایسی ہی زندگی کی خواہش کرے گا جو طولانی ہو تو یہ حیات ابدی جو دنیا و آخرت میں عزت و سربلندی لئے ہوئے ہے ہر انسان کو حاصل نہیں ہوتی ہے یہ چند ہی خوش قسمت ہوتے ہیں جو ہر دور میں حاصل کر پاتے ہیں اور اس حیات ابدی کو حاصل کرنے کے لئے بہت قربانیاں بھی دینا پڑتی ہیں کربلا کی خواتین کی مثال آپ کے سامنے ہے۔ ان خواتین نے گود کے پالوں کو قربان کیا، بے سر و سامانی کے عالم میں قید و بند کی صعوبتیں بھی

جھیلیں مگر قیامت تک کے لئے زندہ جاوید ہو گئیں کل دین کی نصرت کے جرم میں اُن کے سر بے چادر کئے گئے تھے مگر آج ساری انسانیت ان کا نام آتے ہی سر جھکا لیتی ہے۔

مختلف تنظیموں کے کارکنوں سے!

جیسا کہ لفظ تنظیم سے ہی ظاہر کہ ہر تنظیم کسی گروہ برادری یا قوم کو منظّم کرنے کے لئے وجود میں آتی ہے چاہے وہ مذہبی ہو یا سیاسی ہر تنظیم مخصوص نظریات اور افکار کی پرچمدار ہوتی ہے پھر رفتہ رفتہ ایک ہی نظریہ کا پرچار کرنے والے لوگ " نظریاتی اختلافات " کی بنیاد پر مزید تنظیموں میں تقسیم ہو جاتے ہیں اور جہاں صورتحال بدتر ہوتی جاتی ہے وہاں ہمارے ملک کا نقشہ بن جاتا ہے۔

چاہے خالصتاً سیاسی جماعتیں ہوں یا مذہبی جماعتیں سب کا ایک ہی حال ہے یہاں تک کہ تعصّبات اور تفرقہ بازی کے خلاف لڑنے والے لوگ خود اپنی تنظیمی دائرے میں اتنے

تنگ نظر ور متعصب ہو جاتے ہیں کہ انہیں اپنے تنظیمی دائرے سے باہر ہر شخص غدار اور باطل نظر آتا ہے۔ مذہبی جماعتوں میں صورتحال یہ ہو جاتی ہے کہ اپنے خول سے باہر کا ہر فرد دین کا دشمن اور بے دین دکھائی دیتا ہے اور رفتہ رفتہ تنظیم کو دین کے گرد گھمانے لگتے ہیں اور یہ تنظیمیں ایک بت کی شکل اختیار کر جاتی ہے۔

حال یہ ہو جاتا ہے کہ تنظیم کا منشور اور دستور جو کہ آیات الٰہی نہیں ہے۔ اسے ہی سب کچھ سمجھ لیا جاتا ہے اور اسمیں بھی اپنی مرضی اور مفادات کے پیش نظر اتنی ترمیمیں اور تبدیلیاں لے آئی جاتی ہیں کہ وہ ایک مخصوص فرد یا گروہ کے اقتدار کا محافظ بن جاتا ہے۔ یہیں سے تنظیموں کا شیرازہ بکھرنا شروع ہو جاتا ہے جو اصل میں خود قوم کا شیرازہ بکھرنے کا باعث بن جاتا ہے اور پھر وہ لوگ جو گھر سے سامراج کے مقابلے کے لئے نکلے تھے آپس میں مقابلہ کرتے نظر آتے ہیں اور سامراج اپنی کامیابی پر مسکراتا نظر آتا ہے۔

کم از کم ہمارے ملک کی سیاسی اور مذہبی جماعتوں کی یہی تاریخ ہے کہ ان کی کہانی نظریات سے شروع ہو کر افراد پر ختم ہو جاتی ہے۔

اگر ہم دائرہ کو اور محدود کریں اور صرف اپنی ملّت کے تنظیمی سفر پر نظر ڈالیں تو ہمیں یہ بات واضح طور پر نظر آجائیگی کہ استعمار کے مقابلے پر نکلنے والی قوم کس طرح استعماری سازش کا شکار ہو گئی اور استعماری گماشتوں نے کس طرح ہم پر شب خون مار کر ہمارے سارے کام کو اغوا کر لیا۔

اختلافی مسائل میں الجھے بغیر اپنی ملّت کی تنظیموں کے کارکنوں سے میری یہی

اپیل اور التجا ہے کہ تنظیمیں قوم کی فلاح کے لئے بنائی جاتی ہیں چند افراد کے لئے نہیں۔ افراد کی جنگ لڑیں گے تو ہمیں سوائے نقصان کے کچھ بھی ہاتھ نہیں آئے گا۔ ہماری تنظیموں کے قائدین کا اُس وقت قوم سے اخلاص ثابت ہو گا جب وہ قوم کے لئے لڑیں گے منصب و مقام کے لئے نہیں، آپ یہ دیکھئے کہ آپ جس کے ساتھ ہیں وہ مقام پرست ہے یا منصب کو اپنی ٹھوکر میں رکھتا ہے وہ دنیا کے پیچھے بھاگ رہا ہے یا دنیا اس کے پیچھے بھاگ رہی ہے یہاں تو یہ حال ہے کہ وہ لوگ بھی قیادت کے دعویدار ہیں جنکے ساتھ چند افراد نعرے لگانے والے ہوتے ہیں۔

آپ اپنی صلاحیتوں کو کس لئے استعمال کر رہے ہیں قوم و مذہب کے لئے یا شخصیات کے دفاع کے لئے، یہ بہت اہم ہے ایک کارکن کے لئے کہ وہ یہ فیصلہ کرے کہ اپنے مذہب و ملّت سے متعھد (Committed) ہے یا کسی فرد سے ایک مذہبی کارکن اسوقت تک کسی شخصیت سے وابستہ ہوتا ہے جب تک اسے یقین ہو کہ یہ شخصیت بھی مذہب و ملّت سے متعھد (Committed) ہے۔ مگر جب یہ آشکار ہو جائے کہ کسی شخصیت کی وفاداریاں مذہب و ملّت سے نہیں بلکہ اپنی ذات سے وابستہ ہیں تو پھر کوئی جواز نہیں رہ جاتا کہ اسکا ساتھ دیا جائے۔

❀ ❀ ❀

نشانِ راہ!

ملّت کے عزیز جوانو! اب آخر میں راہِ حل کی طرف آناچاہتا ہوں ، اُن عفریتوں سے مقابلے کی راہ جنکی طرف ابتداء میں اشارہ کر چکا ہوں۔

ہر انجمن، ٹرسٹ، ادارہ، اور تنظیم مذہب کی خدمت کے لئے وجود میں آتی ہے۔ اگر یہی انجمن، ٹرسٹ، ادارہ یا تنظیم کسی فرد کی جاگیر بن جائے تو پھر کسی مخلص کارکن کو زیب نہیں دیتا کہ وہ دین کو چھوڑ کر افراد کی تقویت کا باعث بنے۔

موجودہ صورتحال میں ممکن نہیں کہ تمام انجمنوں ، ٹرسٹوں اور اداروں اور تنظیموں کو توڑ کر کوئی ایک تنظیم بنالی جائے مگر یہ تو ہو سکتا ہے کہ تمام تنظیموں وغیرہ پر مشتمل ایک مشترکہ اور متحدہ پلیٹ فارم تشکیل دیا جائے۔ کیونکہ جب تک ساری قوم شریک نہ ہو کوئی مقصد حاصل نہیں کیا جاسکتا اور کوئی ایک تنظیم ایسی نہیں ہے جو ساری قوم کی

نمائندگی کا حقیقی دعویٰ کر سکے۔ایک ایسی قومی پارلیمنٹ یا فورم تشکیل دیا جائے جہاں ساری تنظیموں کی نمائندگی ہو یہ فورم یا پارلیمنٹ دو دو یا تین تین سال کے لئے ایک مجلسِ عمل منتخب کرے یہ مجلس عمل اتنے ہی عرصے کے لئے ایک سیکریٹری جنرل کا انتخاب کرے۔ اس پروسیس سے گزرنے کے بعد اس مجلسِ عمل کو نہ صرف ساری قوم کا اعتماد بلکہ ساری قوم کی پشت پناہی بھی حاصل ہو گی۔

اس مجلسِ عمل کے افراد مختلف شعبوں کی سرپرستی سنبھالیں گے اور تقسیم کار کی ایک بہترین شکل سامنے آئیگی۔ ہمارے اندرونی اختلافات بھی اس فورم میں رکھیں جائیں اور پھر اس فورم کے فیصلے کو حتمی فیصلے کے طور پر تسلیم کیا جائے۔

یقیناً یہ بات کاغذ پر تحریر کرنا بہت آسان اور عمل کے میدان میں اسکا واقع ہونا بہت مشکل ہے مجھے بھی یہ تسلیم ہے کہ یہ بہت مشکل ہے مگر ناممکن نہیں۔اسی لئے میں نے اپنی اس تحریر کو نشانِ راہ قرار دیا ہے منزل نہیں۔ ہماری قوم میں ایسے ایسے مفکر اور دانشور حضرات موجود ہیں جو میرے خیال کے اس قطرے کو سمندر میں تبدیل کر سکتے ہیں۔

مختلف سیاسی جماعتوں اور حکومتی اداروں میں ہمارے بے شمار ایسے دماغ موجود ہیں جو منصوبہ بندی کے ماہر ہیں لیکن افسوس کہ ہمارے پاس ایسا کوئی فورم موجود نہیں جہاں ان کی خدمات لی جا سکیں اور ان کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھایا جا سکے جب ہم کوئی فورم تشکیل دیں گے اور انہیں اعتماد دیں گے تو پھر دیکھئے کہ کچھ افراد کو آپ تلاش کریں گے اور کچھ خود ہی دین وملّت کی خدمت کے جذبے سے سرشار آپ کے پاس آجائیں گے۔

آپ مجبور کریں قوم کے سرکردہ افراد کو کہ وہ ذاتیات کی دنیا سے باہر آکر قوم پر

پڑے اس کڑے وقت میں میدانِ عمل میں اُتریں۔ ماضی کی تلخیاں اور غلط فہمیاں مٹا کر بہتر مستقبل کی جدّ و جہد کریں ورنہ آنے والی نسل ہمیں معاف نہیں کرے گی اور دنیا تو دنیا میدانِ حشر میں بھی ہم ان سے منہ چھپاتے پھر رہے ہوں گے۔

وَمَا علینا اِلاّ البلاغ المبین

نشانات ر ٥١

نشانات د ٥١

نشان ره

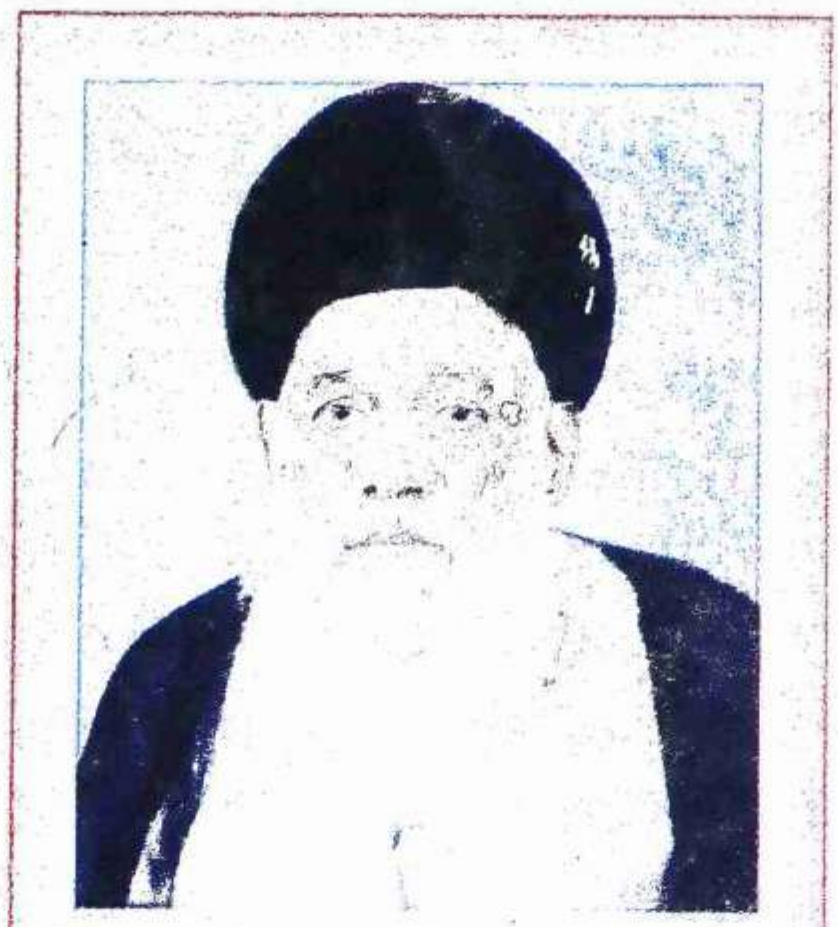

میں یہی کہوں گا کہ ہمارے ملک میں ایسے حساس و فعال ادارے کی ضرورت ہے جس سے وابستہ افراد دینی و دنیاوی علوم سے آراستہ ہوں اور اپنے ملک، اپنی قوم اور اپنے دین کی بہتر سے بہتر طریقے سے خدمت کر سکیں۔

خدا مولانا حسن ظفر نقوی کی سعیِ جمیلہ کو قبول فرمائے جو انہوں نے انتہائی خلوص کے ساتھ اصلاحِ ملت کے سلسلے میں فرمائی ہے۔

سید ابنِ حسن الرضوی (کربلائی)

(آلِ باقر العلومؒ)